رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۸؍

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

مینجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخئیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲-افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں — قدرتِ بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

صفحہ نمبر ۸ کے تین اعلانات بہت اہم ہیں
انھیں ضرور ملاحظہ فرمائیے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۴۰	فہرست مضامین دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۲
جنگ کے حقیقی اسباب ---------- المقتطف ---------- ۴
ہندوستان کے صنعتی مزدور ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۹
یونانی علم الاصنام ---------- خواجہ احمد فاروقی بی۔اے ---------- ۱۶
نگاہِ بازگشت ---------- سید علی سجاد قہر اکبرآبادی۔بی۔اے ---------- ۳۱
چینی باپ کے باغی بیٹے ---------- م۔ع ---------- ۴۲
غالب کی ایک رُباعی ---------- ساحل بلگرامی ---------- ۴۶
اُردو ادب کا سماجی پس منظر ---------- فراق گورکھپوری۔ایم۔اے ---------- ۵۰
مکتوبات نیاز ---------- ۵۶
وقت کی باتیں ---------- ۵۹
منظومات ---------- قہر۔جگر۔اثر۔شمس ---------- ۶۱

ملاحظات

(۲۹ر نومبر ۱۹۴۱ء)

جنگ کا ہولناک مستقبل

جس وقت تک جرمنی نے روس پر حملہ نہ کیا تھا جنگ کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ بحر روم یا بحر اسود سے گزر کر ایشیا اور ہندوستان تک اس خطرہ کے بڑھنے کا اندیشہ پیدا ہوتا یا یہ کہ یورپ ہی میں اس خطرہ کی عمر زیادہ قرار دیجاتی کیونکہ جرمنی، فرانس اور اکثر بلقانی ریاستوں پر اقتدار حاصل کر لینے کے بعد بھی انگلستان پر کوئی کامیاب حملہ نہ کر سکا تھا اور اٹلی و جرمنی کی متحدہ کوششوں کے باوجود بحر روم کی عنان سیادت بدستور برطانیہ کے ہاتھ میں باقی جاتی تھی اور ان حالات میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ یا تو جرمنی پھر انگلستان پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا یا وہ وقت کو اسی طرح ٹالتا رہے گا یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی صورت باہمی مفاہمت کی پیدا ہو جائے گی، لیکن جب اس نے روس پر حملہ کیا تو لڑائی کی نوعیت بدلی، ہوا کا رُخ بدلا، قیاس آرائیاں بدلیں، اور ہم میں سے اکثر نے یہ خیال قائم کیا کہ ہٹلر سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی روس کو ختم کر دے گا اور اس کے بعد جاڑوں کا زمانہ طیاریوں میں صرف کرنے کے بعد وہ پھر انگلستان پر حملہ کرے گا۔ یہ ۲۲ر جون کی بات ہے اور اس زمانۂ انتظار کو ہٹلر کے قول کے مطابق ستمبر کے پہلے ہفتے میں ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن ستمبر کیا نومبر بھی ختم ہو گیا اور فیصلۂ جنگ کے لحاظ سے ہٹلر اب بھی اسی مقام پر ہے جہاں سے اس نے یہ خونخوارانہ اقدام شروع کیا تھا۔

یقیناً اوکرائن کا علاقہ روس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، کریمیا پر بھی اس کا تسلط قائم ہو چکا ہے، ماسکو اور لینن گراڈ بھی خطرہ میں ہیں، لیکن روس کی شکست کا خواب ہنوز تعبیر طلب ہے اور ہٹلر کے سامنے اب صرف ماسکو یا لینن گراڈ نہیں بلکہ اسٹالین کی ہمت اور روسی آبادی کے عزم و ارادہ پر فتح پانے کا سوال ہے، کیونکہ سارا مغربی روس ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی روسی حکومت کا ۲/۳ حصہ بدستور اس کے پاس باقی رہ جاتا ہے اور اگر روسی آبادی اسی طرح دشمن کا مقابلہ کرتی رہی تو ہٹلر شاید برسوں فردِ حساب میں نفع و نقصان کے توازن کو برابر نہ کر سکے گا۔

ہٹلر اس میں شک نہیں بڑا باا قبال شخص ہے، لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ روس پر حملہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے سعد ستاروں نے رجعت قہقری شروع کر دی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سخت "گرہ" اس کی زندگی میں کب تک باقی رہے گی۔

ہٹلر کی تاریخ عروج میں شروع سے لیکر فتح یونان تک (سوائے حملۂ انگلستان کے) کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کو اپنے بنائے ہوئے پروگرام کی طرف سے مایوسی ہوئی ہو، چنانچہ اس نے جس وقت روس پر حملہ کیا تو اسے یقین تھا کہ دس ہفتے اس مہم کے سر کرنے کے لئے کافی ہیں، لیکن یہ دس ہفتے پانچ مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئے اور ہو سکتا ہے کہ ان کا شمار سالوں سے کیا جائے۔

ہٹلر نے جب روس پر حملہ کیا تو اسے دو باتوں کا یقین تھا، ایک یہ کہ روسی افواج جرمن افواج کا مقابلہ زیادہ عرصہ تک نہیں کر سکتیں اور دوسرے یہ کہ روس کی رعایا چونکہ بالشویک حکومت سے بیزار ہے، اس لئے وہاں انقلابی بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہ نکلیں۔ یعنی روسی فوجوں نے بھی نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور ملک کی آبادی نے بھی پورے اتحاد کے ساتھ اپنی حکومت کی مدد کی — لیکن ہٹلر کا یہ داؤں ایسا نہ تھا کہ واپس لیا جا سکتا۔ اس نے اپنی

دونوں غلطیوں کو محسوس کیا، لیکن اب اس کے لئے واپسی کی بھی کوئی صورت نہیں ہے، اس لئے موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ماسکو، لینن گراڈ بلکہ سارے مغربی روس پر جرمن قبضہ ہو بھی جائے تو یہ جنگ ختم نہیں ہوتی اور یہی وہ اندیشہ تھا جسکی بنا پر حال ہی میں روس کے خلاف یورپ کی متعدد حکومتوں کے نمایندوں سے ہٹلر نے مشورہ کرکے روس کے خلاف اپنے محاذ کو زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

جرمنی کے علاوہ محوری دایرہ میں قابل ذکر حکومتیں صرف دو ہیں، ایک جاپان اور دوسرے اٹلی اور اس وقت یہ دونوں خود اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اٹلی کو افریقہ اور بحر روم میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں انھوں نے اطالوی ساکھ کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اس کی صورت بالکل اس شخص کی سی ہے جو دو آگوں کے درمیان بھنپس کر یہ فیصلہ کرنے سے عاری ہے کہ کس آگ کی آغوش میں اپنے آپ کو سونپ دے۔ یعنی اگر وہ جرمنی کا ساتھ دیتا ہے تو اٹلی کا جرمن کی غلامی میں چلا جانا یقینی ہے اور اُس کا ساتھ نہیں دیتا تو دوسری طرف برطانیہ و امریکہ اس کی حکومت کو ختم کئے دیتے ہیں۔

لیبیا میں جو تازہ برطانوی حملہ شروع ہوا ہے، وہ اسی بات کی پیش قدمی ہے اور اس وقت تک جو کامیابیاں برطانوی افواج کو وہاں حاصل ہوئی ہیں وہ نہ صرف اٹلی کے افریقی مقبوضات کو ہمیشہ کے لئے اس سے چھین لینے والی ثابت ہوں گی بلکہ روس کی طرف سے جرمن فوجوں کے دباؤ کو بھی ختم کر دیں گی۔

رہا جاپان، سو امریکہ سے جو گفتگو اس کی ہو رہی ہے اور جس نے مایوس کن صورت اختیار کر لی ہے، ایسی معمولی بات نہیں کہ وہ محوری ادارہ میں شریک ہونے کے بعد جرمنی کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔

یقیناً ہٹلر کو اس سے سخت شکایت ہونا چاہئے کہ اسوقت تک اس نے سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ نہیں کیا لیکن جاپان دیکھ رہا تھا کہ خود ہٹلر کی کامیابی روس میں کس حد تک کارآمد ثابت ہوتی ہے اور چونکہ اس کی یہ اُلجھن ابھی تک دور نہیں ہوئی اس لئے وہ برابر روس کے خلاف قدم اُٹھانے کو ٹال رہا ہے۔

دوسری مصیبت جاپان کے لئے اسی دوران میں یہ پیش آگئی کہ امریکہ اور برطانیہ نے اس کے سرمایہ کو ضبط کر کے اس کے تجارتی و اقتصادی توازن کو بالکل درہم برہم کر دیا اور شرائط ایسی سخت پیش کیں اور اگر وہ انھیں مان لے تو پھر اس کی حالت اب سے ایک صدی پہلے کی سی ہو جاتی ہے — الغرض جنگ جتنی زیادہ طویل ہوتی جاتی ہے، نازی کامیابیوں کا امکان بہت ضعیف ہوتا جاتا ہے اور امریکہ و برطانیہ کی تدابیر زیادہ ٹھوس اور زیادہ مستحکم صورتیں اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

جاپان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بحر پاسفک کا نہیں بلکہ خود بحر جاپان کا ہے، جہاں ولاڈی واسٹک کی روسی بندرگاہ جو دنیا کی بہت بڑے قلعہ بند بندرگاہوں میں سے ہے اس سے اس قدر قریب ہے کہ منٹوں کے اندر وہاں سے ٹوکیو پر بم برسائے جا سکتے ہیں

فرانسیسی انڈوچائنا پر بیشک اس کی فوجوں کا بڑا اجتماع پایا جاتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ اگر لڑائی چھڑ گئی تو وہ سب سے پہلے برما کی سڑک پر حملہ کر کے ہندوستان پر بھی ہوائی تاخت کرے گا، لیکن ایک طرف سنگاپور میں برطانوی طیاریاں، دوسری طرف جزائر فلی پائن میں امریکی طیاریاں اتنی زبردست ہیں کہ جاپان کی بحری اور ہوائی طاقت مشکل ہی سے ان دونوں کا مقابلہ کر سکتی ہے — بہر حال صورتِ حال بہت نازک ہے اور جنگ کا مستقبل روز بروز زیادہ تاریک ہوتا جاتا ہے، جس سے یقیناً ہندوستان کو بھی متاثر ہونا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاثر یہاں کی آبادی پر کس طرح اثر انداز ہو اور ہم کو ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کرنا پڑے۔

جنگ کے حقیقی اسباب

(علمی نقطۂ نظر سے)

دنیا کے تمام واقعات وحوادث جو ہماری نگاہوں سے گزرتے ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی فطری سبب ضرور ہوتا ہے جو ہمیں کبھی نظر نہیں آتا اور جب نظر آتا ہے تو ہم اس پر اسباب کا سلسلہ قائم کر لیتے ہیں، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ درجۂ حرارت کم ہونے کے بعد جب بیرومیٹر ہمیں فضا کی کثافت کی خبر دیتا ہے تو بارش ہوتی ہے، اسی طرح جب کرۂ زمین گردش کرتے کرتے آفتاب سے انتہائی بعد پر پہونچتی ہے تو حرارت آفتاب کم حاصل کرنے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور پانی کی بھاپ مینھ کی صورت میں برسنے لگتی ہے، اس لئے ہم بارش کا سبب ان چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ کا تخم معاہدۂ ورسائی نے بویا تھا، اسی لئے ہٹلر نے اپنی قوم کا غیظ وغضب بھڑکانے کے لئے ہمیشہ معاہدۂ ورسائی کا ذکر کیا۔ لیکن، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاہدۂ ورسائی نتیجہ تھا پچھلی جنگ کا اور پچھلی جنگ بھی جرمنی ہی نے چھیڑی تھی، اس لئے ہٹلر کو "معاہدۂ ورسائی" کی شکایت کیوں ہے!

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ موجودہ جنگ کا سبب واقعی معاہدۂ ورسائی تھا، تو پچھلی جنگ کا سبب کیا تھا جس کا نتیجہ معاہدۂ ورسائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آپ اس کا سبب اُس لڑائی کو قرار دیں گے جب ۱۸۷۰ء میں بسمارک نے فرانس کو فتح کر کے ورسائی ہی میں فاتحانہ شرائط فرانس سے تسلیم کرائی تھیں، پھر اگر کوئی اس ۱۸۷۰ء کی لڑائی کا سبب دریافت کرے گا، تو آپ اس سے قبل کس کس لڑائی کا ذکر کریں گے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ شاید قابیل وہابیل تک پہونچ جائیگا اور جب بھی لڑائی کا کوئی معقول سبب نہ دریافت ہو سکے گا۔

اگر آپ عہدِ قدیم سے لیکر اس وقت تک لڑائیوں کی تاریخ اور ان کے اسباب ونتائج پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر لڑائی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی جدید اجتماعی یا سیاسی نظام ضرور لائی۔ جب بنی اسرائیل کی لڑائیاں کنعانیوں سے ہوئیں تو نظام بطریقی کی صورت قایم ہوئی، لیکن بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی اجتماعی زندگی بغیر مشاورتی نظام کے نہیں سنبھل سکتی تو انھوں نے اس نظام کو اختیار کر لیا۔

یوروپ میں اقطاعی نظام (فیوڈل سسٹم) کا رواج بھی انھیں لڑائیوں کا نتیجہ تھا جو بادشاہوں کے درمیان حصول اقتدار وسیادت کے لئے لڑی گئیں، کیونکہ بادشاہوں کو فوج کے سپاہی صرف امرار کی وساطت سے مل سکتے تھے اور ان امرار کو فراہمی فوج اور اس کے مصارف کے لئے جاگیریں ملا کرتی تھیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اہلِ صنعت وحرفہ اور تاجروں کا طبقہ وجود میں آیا تو جاگیردار امراء کے یہاں مزارعین کی کمی ہوئی اور وہ اپنی املاک بیچنے پر مجبور ہوئے یہانتک کہ

اراضی ٹکڑے ہو ہو کر بہت سے لوگوں میں تقسیم ہوگئی اور اقطاعی نظام ختم ہو کر، شخصی حکومت قایم ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ڈماکریسی کی بنیاد پڑی۔ لیکن یہ تمام انقلابات بغیر لڑائیوں کے نہیں ہوئے، اور ان لڑائیوں کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ "اجتماعیت" نے پرانے نظام کو توڑ کر دوسرا نظام قایم کرنا چاہا۔

احساس "اجتماعیت" یا سوسائٹی کا نظام ہمیشہ ماحول اور افراد کے ذہنی ارتقاء کا تابع رہا ہے، یعنی جوں جوں انسان نے ذہنی ترقیاں کیں، اس کا تمدن بھی بڑھا، اس کی ضروریات بھی وسیع ہوئیں، خواہشیں بھی اس میں نئی نئی پیدا ہونے لگیں اور جب اس نے دیکھا کہ یہ تمام باتیں کسی نظام سے پوری نہیں ہوتیں تو اس میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ پھر چونکہ کسی قوم کے تمام افراد کی ذہنیت ایک ہی وقت میں ایک ہی طرح تغیر پذیر نہیں ہوتی، اس لئے جب کبھی یہ صورتیں ظاہر ہوئیں تو ہمیشہ دو گروہ پیدا ہوگئے، ایک وہ جو قدیم نظام ہی کو بربنائے روایات صحیح و درست سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو اس سے مطمئن نہ تھا اور اس طرح آپس میں خونریزیاں ہوئیں۔ پھر اگر جدید خیال کا گروہ کامیاب ہوگیا تو اس نے پرانے نظام کو بدلدیا ورنہ وہی بدستور قایم رہا۔

مثلاً آپ ڈماکریسی ہی کو لیجئے، کہ اس نے شخصی حکومت کے خلاف کتنے طویل عرصہ تک جہاد جاری رکھا، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ شخصی حکومت کے طرفدار زیادہ قوی تھے اور وہ ڈماکریسی کو ابھرنے نہ دیتے تھے، لیکن جہاں جہاں ڈماکریٹک خیال والوں کو ابھرنے کا موقعہ ملا انھوں نے پرانے نظام کو بدلدیا، چنانچہ بویر میں لڑائی ہوئی تو جنوبی افریقہ کے مستعمرات متحد ہوگئیں اور شمالی امریکہ نے جنگ کی تو وہ انگریزی تسلط سے آزاد ہوگیا۔

اب آیئے اس حقیقت کو سامنے رکھکر موجودہ جنگ کے واقعی اسباب پر غور کریں اور دیکھیں کہ یہ خونریزیاں کیوں اور کس نئے نظام کے لئے ہو رہی ہیں، ہر لڑائی کا فطری سبب ضروریات زندگی پورا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا جنگ فی الحقیقت روٹی کی لڑائی ہے یا دنیا میں زندہ و باقی رہنے کے لئے آپا دھاپی!۔ اس لئے جنگ کا سب سے پہلا سبب اقتصادی ہوا کرتا ہے۔ ہٹلر کہتا ہے "ہم اپنی نوآبادیاں چاہتے ہیں تاکہ ہم زندہ رہیں"۔ مسولینی کہتا ہے "ہماری زمین ہم پر تنگ ہوگئی ہے، اسلئے ہمیں زندہ رہنے کے لئے اور زمینوں کی ضرورت ہے"۔ یقیناً اس دعوے نے انھیں حکومت کی کرسی تک تو پہونچا دیا ہے لیکن قوم کو اس سے کوئی فایدہ نہیں پہونچا، اور وہ زندگی کے لئے بدستور سخت جدوجہد میں مصروف ہے۔

ہٹلر نے اپنے خطبوں میں ہمیشہ یہی کہا کہ "معاہدۂ ورسائی نے جرمنی سے اس کی نوآبادیاں چھین کر بیروزگاری بڑھادی ہے، اس لئے میں ان کو واپس لے کر رہوں گا"۔ اس آواز کا اثر جرمن مزدوروں پر بھی ہوا، کیونکہ وہ اپنی اقتصادی دشواریوں کا علاج یہی سمجھتے تھے اور وہاں کے سرمایہ داروں پر بھی کیونکہ اس طرح ان کو دولت کمانے کے ذرایع ہاتھ آتے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جرمنی واقعی مفلس ہوگیا تھا، کیا اطالیہ در اصل فاقے کر رہا تھا اور کیا فی الحقیقت ان ملکوں کے مزدوروں کے لئے رزق ختم ہوگیا تھا؟ اگر کوئی شخص اس کا جواب اثبات میں دیگا، تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ:۔ لڑائی کا یہ بے شمار بیش بہا سامان کہاں سے آیا۔ چار ہزار ٹینک جن میں سے ہر ایک متحرک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے، ۲۰ لاکھ دیوپیکر توپیں، کروروں بم، ۱۸۰ آبدوز کشتیاں، ۴۰ ہزار طیارے، ۲۰ کرور جدید ترین آلات حرب سے آراستہ فوج اور پھر اسی کے ساتھ سپاہیوں کے لئے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور تفریح و دلچسپی کا تمام سامان جس کی قیمت کا کوئی

اندازہ نہیں ہوسکتا، کیونکر فراہم ہوسکا! کیا ساری وہ دولت جوان طیاریوں میں صرف ہوئی ہے، پچھلی لڑائی سے اِس وقت تک تمام جرمن آبادی کو بافراغت زندگی بسر کرنے کے لئے کافی نہ ہوسکتی تھی، اور کیا اتنی بے اندازہ دولت موجود ہونے کے باوجود جرمن قوم کو فقر و فاقہ کی شکایت تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ناتسی حکومت کے دور میں مزدوروں اور صناعوں پر جو کچھ صرف کیا گیا ہے اس سے مقصود بیروزگاری دور کرنا یا جرمن قوم کو فقر و فاقہ کی مصیبت سے آزاد کرانا نہ تھا، بلکہ اصل سبب وہی تھا جس کا ذکر ابھی کیا جاچکا ہے، یعنی یوروپ کے موجودہ سیاسی و اجتماعی نظام کو ختم کرکے دوسرا نظام قایم کرنا، کیونکہ موجودہ نظام اس وقت کی بڑھی ہوئی صنعتوں اور عظیم الشان تجارتی اداروں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا!

یہ ماننا پڑے گا کہ موجودہ اجتماعی نظام نے نہ صرف بیروزگاری اور مسلسل اقتصادی دشواریاں پیدا کیں، بلکہ انکے امن و سکون کو بھی سخت صدمہ پہونچایا؛ اس لئے دنیا کا اضطراب ایک ایسے نقطہ پر پہونچگیا تھا کہ انقلاب ضروری تھا؛ اور اس لئے کہا جاتا ہے کہ ناتسیت، ہٹلر کی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ خود ہٹلر کو ناتسیت نے پیدا کیا ہے، اور ہر وہ شخص جوان نفسیاتی لمحوں سے فایدہ اُٹھاکر باہر نکل آتا ہٹلر بن سکتا تھا!

لیکن وہ اجتماعی اضطراب جس نے دُنیا میں ہٹلر کو پیدا کیا، کیوں نمودار ہوا، اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری اور طبقۂ عمال میں عرصہ سے ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے جنگ جاری ہے، سرمایہ دار چاہتا ہے کہ وہ مشینوں کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ صنعتی پیداوار فراہم کرے، لیکن مشینیں جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہیں، طبقۂ عمال میں اتنی ہی بیروزگاری بڑھتی جارہی ہے، کیونکہ جس کام میں ایک ہزار مزدور دن بھر لگے رہتے تھے، اُسے مشین صرف دس مزدوروں کی مدد سے ایک گھنٹہ میں پورا کرلیتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہڑتالوں کی صورت میں ظاہر ہوا، اور سرمایہ داروں کی توقعات کو بھی صدمہ پہونچنے لگا۔ یہاں تک کہ آپس کی یہ کشاکش لاینحل مسئلہ ہوگیا۔ ضرورت تھی کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جو سرمایہ و عمل دونوں کو مطمئن کرسکے اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو نو آبادیاں بڑھائی جائیں یا دوسرے ملک فتح کئے جائیں اور ان صورتوں پر عمل کرنا بغیر لڑائی کے ممکن نہیں — لڑائی ایک طرف ملک کی اکثر آبادی کو کام میں لگا دیتی ہے اور دوسری طرف سرمایہ داروں کو موقعہ دیتی ہے کہ وہ اسلحہ و دیگر سامان حرب کی طیاری میں اپنا سرمایہ لگاکر فایدہ اُٹھائیں اور اس طرح دونوں فریق مطمئن ہوکر ایک دوسرے کی مخالفت سے باز آجاتے ہیں۔ چنانچہ ہٹلر نے اسی تدبیر سے کام لیکر ملک کو مسلح کرنا شروع کیا تاکہ طبقۂ عمال اور سرمایہ دار دونوں مصروف رہیں اور جب وہ مسلح کرچکا تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ تھا، کیونکہ بصورت دیگر ان طیاریوں کے کوئی معنی نہ تھے، یہ تو ہوا اقتصادی نظام کا نقص جس نے لڑائی کے بھڑکانے میں مدد دی لیکن اسی کے ساتھ دوسری چیز جس نے دُنیا کو لڑائی سے قریب تر کردیا، سیاسی عدم توازن بھی تھا جو معاہدۂ ورسائی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اس عدم توازن نے "قومیت" کے جذبہ کو عام کردیا اور "بین الاقوامیت" کو ختم! — یوروپ کے ہر حصہ میں یہ جذبہ عام ہوگیا کہ قومیت کے لحاظ سے ملکوں کی حدبندی ہونا چاہئے اور ہر ملک اپنی اپنی جگہ "تنازع للبقا" میں مصروف ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست خارجہ میں گتھیاں پڑنے لگیں، اقتصادی دشواریاں دور کرنے کے ذرایع تنگ ہوگئے، اور ہر ملک اس کوشش میں مصروف ہوگیا، کہ جس جس حصۂ زمین میں اس کی قوم کے لوگ

پائے جاتے ہیں وہ اسی کی حکومت و سیادت میں آجائیں، الغرض ہر طرف آپا دھاپی شروع ہوگئی اور بین الاقوامیت کا رشتہ جس نے تمام ملکوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا، ڈھیلا پڑ گیا۔

الغرض یہ جنگ، پرانے اور نئے نظام کی جنگ ہے، اس لئے اُصول سے گزر کر شخصیتوں سے بحث کرنا، حقیقی اسباب کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ہے۔ لیکن یہ نیا نظام کیا ہے؟

لڑائی سے بہت پہلے ہی طبقۂ عمال اور طبقۂ متوسط (بورزوا) چیخ رہے تھے، کہ اقتصادی نظام میں سرمایہ داروں کا پلّہ بھاری نہ رہنا چاہئے، لیکن ایسی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی کہ سرمایہ داروں کے سرمایہ سے جو دولت حاصل ہوتی ہے اسے اطمینان بخش طریقہ پر تقسیم کی جا سکے، آخر کار بعض حکومتوں نے اس طرف توجہ کی اور انھیں میں سے ایک جرمن بھی تھا اس نے تمام صنعتی اداروں پر حکومت کا تسلط قایم کر لیا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اقتصادی عدم توازن کو امن پسندانہ طریقہ سے دور کرتا، اس نے ملک کے تمام صنعت، حرفت و تجارت پر قبضہ کر کے ساری آبادی کو مسلح بنانا شروع کیا اور اس طرح اس نے سرمایہ و عمل کی جنگ کا رُخ ایک اور جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جب انگلستان نے دیکھا کہ جرمنی اور اٹلی کی عسکری طیاریاں صرف مذاق نہیں ہیں تو اس نے بھی پارلیمنٹ کی موافقت سے ملک کے مصنوعات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سرمایہ داروں کا پلّہ وہاں بھی ہلکا ہوگیا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ جرمنی، اٹلی اور برطانیہ یہی تینوں حکومتیں تھیں جو اشتراکی نظام کی مخالف تھیں اور اب جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ اس طرف مایل ہوتی جا رہی ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ قوم ایک کلی حیثیت رکھتی جس کے اجزاء قوم کے افراد ہیں، اور جب قوم خطرہ میں ہو تو اس کے تمام افراد کا فرض ہے کہ وہ اشتراکِ عمل میں برابر کا حصہ لیں۔ اگر جنگ کے بعد بھی حکومتوں کا یہی خیال قایم رہا تو اس لڑائی کو رحمتِ ایزدی سمجھنا چاہئے، کیونکہ دُنیا میں بقاء امن و سکون کی صرف یہی صورت ہے کہ فرق مراتب کو دور کر کے دولت و عمل کی تقسیم ضرورت و اہلیت کے لحاظ سے کی جائے۔

سیاسی حیثیت سے نظام جدید جو کچھ چاہتا ہے، وہ بھی توجہ طلب ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دُنیا کی تمام حکومتیں ایک "وحدت" سے وابستہ ہو جائیں، یعنی وہ سب ملکر ایک "وفاقی حکومت" قایم کریں، جیسا کہ امریکہ، سوئٹزرلینڈ کناڈا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔

موجودہ جنگ میں جب فرانس کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے اس کے سامنے وفاق ہی کی صورت پیش کر کے خواہش ظاہر کی تھی کہ دونوں ملک ایک حکومت اور ایک میزانیہ کے تحت کام کریں، لیکن فرانس نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر فرانس مان لیتا، تو شاید جنگ کا موجودہ نقشہ بدل جاتا اور "وفاقی وحدت" کی یہ بڑی زبردست بنیاد ہوتی۔

بہرحال اس جنگ کے بعد دُنیا کا سیاسی و اقتصادی نظام بالکل بدل جانا ہے اور اگر یہ نظام واقعی مُفید ثابت ہوا تو امید کی جاتی ہے کہ ایک عرصۂ دراز کے لئے دُنیا میں امن قایم ہو جائے گا، ورنہ یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا، اور کرۂ زمین پر آگ و خون کا کھیل برابر اسی طرح کھیلا جاتا رہے گا۔

المقتطف

بالکل آخری اطلاع

اگر آپ نے اس اشاعت کے بعد نگار کی خریداری جاری نہ رکھی تو آپ کے لئے یہ بالکل آخری اطلاع ہے کہ:
آیندہ جنوری ۴۲ء کا نگار کسی نہ کسی وقت آپ ضرور طلب فرمائیں گے اور پھر آپ کو یہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا۔
دوسری بات آپ کے سوچنے کے قابل یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس جنوری ۴۱ء کا نگار موجود ہے تو اس کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب آپ جنوری ۴۲ء کا نگار بھی حاصل کریں۔
جنوری ۴۱ء کے نگار میں آپ نے اس وقت کے مشہور غزلگو شعراء کا انتخاب کلام تو ملاحظہ فرمالیا، لیکن نقادان فن کی نگاہ میں وہ کلام کیا حیثیت رکھتا ہے اس کا حال آپ کو صرف جنوری ۴۲ء کے نگار سے معلوم ہو سکتا ہے۔

جن حضرات نے اس میں حصہ لیا ہے اُن کے نام یہ ہیں:-
پروفیسر کلیم الدین احمد — پٹنہ یونیورسٹی — پروفیسر آل احمد سرور — مسلم یونیورسٹی
ڈاکٹر تاثیر — پرنسپل سری نگر کالج — پروفیسر مجنوں گورکھپوری — سینٹ اینڈرو ز کالج گورکھپور
نیاز فتحپوری — اڈیٹر نگار — اس سے انکار ممکن نہیں کہ جنوری ۴۱ء اور جنوری ۴۲ء کے نگار کے پرچے دونوں ملکر شعر و ادب اور نقد و تبصرہ کی دنیا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور زمانہ مستقبل میں نقادان فن نگار کے انھیں دو پرچوں کی بنیاد پر اپنے تذکرے مرتب کریں گے اس لئے اگر وہ چیز جس پر "ادب مستقبل" کی تعمیر ہونے والی ہے آج ہی آپ کو ملجائے تو کیا آپ اسے حاصل نہ کریں گے۔ یاد رکھئے کہ نگار کے پچھلے بعض بعض خاص نمبر اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتے مومن نمبر، ظفر نمبر کے لئے روزانہ خطوط آتے ہیں لیکن وہ اب نایاب ہیں۔ اُردو شاعری نمبر کی قیمت بھی اب بجائے دو روپیہ کے چھ روپیہ کر دی گئی ہے۔ اس لئے یاد رکھیئے کہ اگر آپ نے اس وقت جنوری ۴۱ء کا نگار حاصل نہ کیا تو پھر آپ کو یہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا۔ اس لئے قبل اس کے کہ آپ آیندہ خریداری کے متعلق ہاں یا نہیں کا فیصلہ کریں، یہ سمجھ لیں کہ نگار کے مسئلہ میں "نہیں" کا فیصلہ ہمیشہ سو فی صدی غلط ہوا کرتا ہے۔

منیجر نگار

ایک اور ضروری اعلان

دیکھا جاتا ہے کہ جنوری کا پرچہ روانہ ہونے کے بعد بعض حضرات کا منی آرڈر وصول ہوتا ہے اور اس طرح دفتر کو محصول ڈاک کا نقصان ہوتا ہے اسلئے جنوری کے وی۔ پی بجائے ۲۰ جنوری کے ۶ جنوری سے روانہ کئے جائیں گے اور اس طرح ہم آپکے منی آرڈر کا انتظار ۱۵ تک کر سکیں گے

رعایتی چندہ بالکل ختم

کاغذ کی گرانی نے مصارف اتنے بڑھا دئے ہیں کہ ہم پانچ روپیہ سالانہ میں بھی پرچہ مشکل سے فراہم کر سکتے ہیں، چہ جائیکہ اس سے کم میں، اس لئے جن لائبریریوں یا طلبہ کو نگار رعایتی قیمت میں دیا جاتا تھا، جنوری آیندہ سے انھیں بھی پورا چندہ ادا کرنا ہوگا۔

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستان کے صنعتی مزدور

صنعتی مزدوروں کا ذکر کرنے سے پیشتر، ہندوستان کی صنعتی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ہندوستانی صنعت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ہندوستانی مصنوعات تین ہزار سال قبل مسیح بابل کے بازاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں اور دو ہزار سال قبل مسیح ہندوستان کی ململ مصری ممیوں کو لپیٹنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ سلطنت روما کے دورِ عروج میں بھی ہندوستان کا کپڑا کثرت کے ساتھ وہاں کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا۔ اہل روما کو اسکی شکایت تھی کہ "روم کی کثیر دولت ہر سال ہندوستانی مصنوعات کی بدولت روم سے ہندوستان منتقل ہو رہی ہے" اور ڈھاکہ کی ململ یونان میں "گنگیٹکا" کے نام سے مشہور تھی"۔[1] لسٹر ہچنسن کا بیان ہے کہ اب سے پانچ صدی پہلے تک ہندوستانی مال، بحر احمر سے ہو کر گزرتا تھا اور اسکندریہ اس کا سب سے بڑا بازار تھا، جہاں دونوں ملکوں (ہندوستان و یورپ) کے تاجر مسالا، ریشم اور جواہرات کا سودا کیا کرتے تھے"[2]

تاریخ ہند کا وہ دور جو برطانوی تسلط کے بعد ختم ہوا، اگرچہ دودھ اور شہد کی ندیوں کا دور نہ تھا، پھر بھی ہندوستان کی حالت مقابلۃً اور ملکوں سے بہتر تھی۔ بنگال کی صرف ایک ادنیٰ تجارتی منڈی قاسم بازار سے تقریباً سوا تین کرور روپیہ کی قیمت کا ریشمی کپڑا ہر سال ممالک غیر کو جاتا تھا۔ ہمارے ملک کے مشہور اور مستند مورخ رادھا کمند مکرجی نے اپنی کتاب "ہندوستان کی تاریخ جہاز رانی" میں ہم کو بتلایا ہے کہ ہمارے جہاز ران خلیج بنگال کی راہ سے چین و جاپان اور خلیج فارس کے راستہ سے عرب و ایران و یورپ اپنا سامان تجارت لے جایا کرتے تھے" ابتدائی دور میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانی کپڑے یورپ کے بازاروں میں لے جا کر فروخت کیا کرتی تھی۔ ہچنسن لکھتا ہے کہ:

"سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں، جب کہ برطانوی اقتدار ہندوستان میں قایم ہو رہا تھا، انگریزی سرمایہ داری کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانی سامان یورپ کے بازاروں میں لاکر فروخت کیا جائے نہ کہ یہ کہ انگریزی مال ہندوستان لایا جائے۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے جو کرگھا اور چرخے سے طیار کئے جاتے تھے وہ یورپ کے کپڑوں سے بدرجہا بہتر ہوتے تھے۔ اس لئے اسوقت تو ولایتی کپڑا ہندوستان لے جانا ایسا ہی ہوتا جیسے آج کوئلہ نیوکاسل (New Castle) لیجایا جائے"[3]

---

[1] Industrial Commission Report (Malvia's note of Dissent) R 295
[2] Lester Hutchinson, "The Empire of the Nobobs." P. 12.
[3] Ibid P. 112

ہندوستان کی جدید صنعت کی تاریخ بہ اعتبار عمر، یورپ کی صنعت کی تاریخ سے بہت چھوٹی ہے۔ اس کی زندگی اُنیسویں صدی کے آخری زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں پورے ملک میں تقریباً ۵۸ کارخانے تھے جن میں تقریباً ۴۰ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں مسٹر آر۔ کے۔ داس کے بیان کے مطابق مزدوروں کی تعداد صرف جوٹ (Jute) کے کارخانوں میں ۵۹۲۲۲ ہوگئی[1]۔ کچھ دنوں کے بعد کارخانوں کی تعداد بڑھ کر ۲۶۴ اور مزدوروں کی تعداد ۲۶ ہزار ہوگئی۔

ہندوستانی صنعت کی ترقی کا پہلا دور ۱۸۸۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ اِس دور میں ترقی کی رفتار سُست رہی۔ لیکن "یہ زمانہ کارخانہ داروں کے لئے بیحد سازگار رہا۔ زرعی مزدوری بیحد کم تھی، ضروریاتِ زندگی کی چیزیں نسبتاً ارزاں تھیں اور کارخانہ دار جتنے مزدور چاہتے اُن کو اردگرد کے دیہاتوں میں من مانی مزدوری پر مل جاتے ۔۔۔۔۔۔ کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو بھی مشین کا ایک جزو سمجھا جاتا، بچّوں کی محنت سے ناجائز فایدہ اُٹھایا جاتا اور کام کے مقابلہ میں انسانیت کے پہلو کو نظر انداز کیا جاتا"[2]

ذیل کے اعداد و شمار سے پہلے دور کی صنعتی ترقی کی رفتار کا تفصیلی اندازہ ہوگا:

سنہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	مزدور بچے	کل جمع
۱۸۸۰	۵۸	۰	۰	۰	۴۰۰۰۰
۱۸۹۴	۸۱۵	۲۷۵۸۰۶	۵۳۱۲۷	۲۰۸۷۷	۳۴۹۸۱۰
۱۸۹۸	۱۰۹۸	۳۳۴۵۹۴	۶۰۶۰۳	۲۷۵۳۲	۴۲۲۷۲۹
۱۹۰۲	۱۵۳۳	۴۲۴۳۷۵	۸۵۸۸۲	۳۱۳۷۷	۵۴۱۶۳۴
۱۹۰۶	۱۸۸۵	۵۴۶۶۹۳	۱۰۲۲۹۶	۴۱۲۲۳	۶۹۰۷۱۲
۱۹۱۰	۲۳۵۹	۶۲۴۹۴۵	۱۱۵۵۴۰	۵۲۰۲۶	۷۹۲۵۱۱
۱۹۱۴	۲۹۳۶	۷۴۶۷۷۳	۱۴۴۱۵۷	۶۰۶۴۳	۹۵۰۹۷۳

اس دور کی صنعتی ترقی میں بہت سے اسباب مُعاون ہوئے۔ سب سے پہلے تو ملک کے اکثر قوم پرست لیڈروں نے (جن میں دادا بھائی نوروزجی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) صنعتی ترقی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنی شروع کی۔ اُن کا خیال تھا کہ ملک میں جو کال پڑ رہے ہیں، اُن کی اصل وجہ صنعتی پستی ہے۔ یہ خیال شاید سب سے پہلے اُس کمیشن نے ظاہر کیا تھا جو کال کے اسباب کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ پھر اس خیال کی تائید ۱۹۰۱ء کے

---

[1] R. K. Dass, "Factory Labour in India" P. 15

[2] The Indian year Book 1931, P. 514.

کمیشن نے بھی کی۔ لیکن اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ثابت ہوئی وہ سودیشی کی تحریک تھی جو تقسیم بنگالہ کے بعد پورے ملک میں شروع ہوگئی تھی۔ فضل بھائی کریم نے ۱۹۰۹ء میں اپنی صدارتی تقریر میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ "سودیشی کی تحریک مل کے مالکوں کے لئے شگون نیک ہے اور اُن کو اس سے پورا پورا فایدہ ہوگا"

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کی لڑائی نے ہندوستانی صنعت کو کافی ترقی دی۔ چنانچہ ٹاٹا کمپنی کی تمام تر ترقی گزشتہ جنگ عظیم ہی کی رہینِ منت ہے۔ آج اُس کا شمار دُنیا کے آٹھ بڑے کارخانوں میں ہوتا ہے۔ اِس دور میں ہندوستانی صنعتوں نے بہت ترقی کی۔ صنعت و تجارت پر سرمایہ داروں نے جو رقمیں لگائیں، اُس پر اُن کو بے شمار نفع ہوا..... لیکن اُن لوگوں کا کسی نے کوئی خیال نہ کیا جو ہندوستان کی دولت میں اضافہ کا اصل سبب تھے۔ اور اُسوقت بھی مزدوروں کو مشین کا پُرزہ ہی سمجھا گیا"[1]

حالات کی مساعدت کے ساتھ ساتھ، حکومت نے بھی ہندوستان کی صنعتی ترقی کی راہ میں آسانیاں پیدا کیں — ۱۹۱۶ء میں حکومت نے روئی کی درآمد پر ½ ۷ فیصدی ڈیوٹی بڑھادی اور دوسری طرف ہندوستان میں طیار ہونے والے سوتی کپڑوں پر کوئی ڈیوٹی نہیں بڑھائی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی مل کے مالکوں کی اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی تھی۔ دوسری طرف لڑائی نے برطانوی صنعت کو درہم برہم کردیا تھا، اس لئے لنکاشائر کے مال کے مقابلہ کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

اس دور میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کا اندازہ ہم کو اُن اعداد و شمار سے بھی ہوتا ہے جو انڈیا آفس نے ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام کے سامنے ہندوستانی مزدوروں سے متعلق پیش کئے تھے:

زرعی مزدور (جن میں کاشتکار مالکان آراضی شامل نہیں ہیں اور جن کی تعداد ۶۶۴۸۸۶ ہے) جو بین الاقوامی مزدور سبھا کی حدود میں آتے ہیں ——— ۲۷۸۱۰۱۳۰

بحری و ساحلی مزدور ——— ۱۴۱۰۰۰

صنعتی مزدور — (جن میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں، کارخانوں اور حمل و نقل کے مزدور شامل ہیں) ۲۰۲۱۹۰۰۰

مجموعی تعداد ——— ۴۸۱۷۰۱۳۰

صنعتی کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد کا بہتر اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا:

سنہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	مزدور بچے	مجموعی تعداد
۱۹۱۴	۲۹۳۶	۷۴۶۷۷۳	۱۴۴۱۵۷	۶۰۶۴۳	۹۵۰۹۷۳
۱۹۱۸	۳۴۳۶	۸۹۷۴۶۹	۱۶۱۳۴۳	۶۴۱۱۰	۱۱۲۲۹۲۲

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مزدوروں میں اپنی تنظیم کا احساس پیدا ہوگیا۔ لیکن یہ احساس کسی سیاسی د

[1] The Indian Year Book 1931 P. 514.

جماعتی شعور کا نتیجہ نہ تھا بلکہ جنگ کی وجہ سے چونکہ ضروریات زندگی کی ہر چیز بیحد گراں ہو گئی تھی اور اس گرانی کے تناسب سے اُن کی مزدوری میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اس لئے ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جا بجا ہڑتالیں بھی ہوئیں اور اُن میں کچھ کامیاب بھی ہوئیں۔

مزدوروں کی پہلی انجمن مدراس میں قایم ہوئی[1]۔ یہ سوتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی یونین تھی۔ اس کے بعد کلکتہ کے ساحلی مزدوروں نے اپنی ایک یونین بنائی۔ اور تیسری یونین بمبئی کے پوسٹ مینوں کی بنی۔ لیکن اِن تمام یونینوں کا مقصد صرف اقتصادی دشواریوں پر قابو حاصل کرنا اور کام میں آسانی پیدا کرنا تھا۔

غیر منظم مزدور مزدوروں میں اگر ہم اُن لوگوں کو بھی شامل کرلیں جو تجارتی اور سرکاری دفاتر کے ملازمین ہیں اور جن کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے (اور جنکی تعداد تقریباً ½ ۱ کرور ہوگی)، تو ہندوستان میں مزدوروں کی تعداد پانچ کرور ہو جاتی ہے۔ لیکن اعلیٰ صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے کچھ مزدور ایسے بھی ہیں جن کو مردم شماری کے رجسٹر میں "خانگی ملازمین" کے خانہ میں رکھا جاتا ہے۔ ان کی تعداد ریل کے کارخانوں اور معدنی ذخیروں میں کام کرنے والوں سے چھ گنا زیادہ ہے۔ مگر یہ سب کے سب غیر منظم ہیں۔

وہ مزدور جو سرکاری عمارتوں، پلوں، ریلوے لائنوں، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں اُن کی تعداد اسّی لاکھ کے قریب ہے۔ اِن کی حالت سب سے زیادہ تباہ رہتی ہے۔ یہ سب کے سب ٹھیکہ داروں کے ماتحت ہوتے ہیں اور مزدوری نہ تو متعین ہوتی ہے اور نہ اُس کے ملنے کا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے۔ کمسن اور نوعمر مزدوروں کو (جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں) ٹھیکہ دار ایک یا دو آنہ سے کسی حال میں بھی زیادہ نہیں دیتے۔

غیر منظم مزدوروں کے دو اور قابل ذکر گروہ ہیں ایک تو نجی طور پر کپڑا بننے والوں کا اور دوسرا دھوبیوں اور حجاموں کا۔ اول الذکر کی تعداد تقریباً تیس لاکھ اور موخرالذکر کی تقریباً بیس لاکھ ہوگی۔ کپڑا بننے والے ظاہرا بالکل آزاد کاروبار کرنے والے معلوم ہوتے ہیں اور پہلی نظر میں اُن کی مالی حالت بہتر نظر آتی ہے۔ مگر یہ پورا طبقہ مہاجنوں کا غلام ہوتا ہے اور اُن کی اقتصادی حالت بیحد تباہ ہے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ بازار سے سوت اور دوسری ضروریات خرید سکیں، چنانچہ یہ لوگ سوت وغیرہ مہاجن سے قرض لاتے ہیں اور ان کے طیار کئے ہوئے کپڑے کو بازار میں بھی مہاجن ہی فروخت کرتا ہے۔ اس طرح سے مہاجن اس طبقہ کی محنت سے پورا پورا فایدہ اُٹھاتا ہے اور خود محنت کرنے والے کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے افراد کی سالانہ آمدنی کسی حال میں بھی دو سو روپیہ کے آگے نہیں بڑھتی۔ کپڑا بننے والوں کے برعکس حجاموں اور دھوبیوں کی حالت نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بہت سے کارخانے ایسے ہیں جن پر فیکٹری ایکٹ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ وہ کارخانے ہیں جہاں یا تو برقی قوت استعمال نہیں کی جاتی یا جہاں مزدوروں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ یہ کارخانے چونکہ اُن قیود سے

---

[1] مسٹر شلونکار کے بیان کے مطابق مزدوروں کی پہلی انجمن مدراس میں قایم ہوئی۔ مگر یہ مشتبہ ہے، شاید پہلی انجمن ۱۸۸۴ء میں بمبئی میں قایم ہوئی۔
(Vera Anstey, 'The Economic Development of India' P. 314)

آزاد ہوتے ہیں جو اعلیٰ صنعتی کارخانوں پر عائد ہیں اور چونکہ ان کو بازپرس کا بھی کوئی خوف نہیں ہوتا، اس لئے وہاں بے حد بے عنوانیاں ہوا کرتی ہیں۔ مزدوری بہت کم دیجاتی ہے اور کام بہت زیادہ لیا جاتا ہے۔ مسٹر بی، شیوا راؤ لکھتے ہیں کہ:

"چرم سازی کے کارخانوں میں کام بارہ گھنٹے سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ مدراس پریسیڈنسی میں چھوٹے اور بڑے لڑکے رات کو بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں کو جوانوں سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، اگرچہ اُن کو زاید محنت کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا"[1]

اُن کی تنخواہ آٹھ دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اُس کے تقسیم ہونے کا بھی کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔

غیر منظم مزدوروں کے سلسلہ میں بیڑی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ انکی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا ہے۔ بہار اور بنگال میں ان کی بہت کثرت ہے۔ ان صوبوں میں آپ کو صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی دو چار بیڑی بنانے والے ضرور ملیں گے۔ یہ لوگ بالعموم بیڑی بیچنے والوں اور پان فروشوں کے ملازم ہوتے ہیں یا اکثر اُجرت یا ٹھیکہ پر کام کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی بھی بہت کم ہوتی ہے جو کسی حال میں بھی چار آنہ یومیہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ کلکتہ میں تو بیڑی بنانے والوں کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

بعض شہروں میں بیڑی بنانے کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ ان کارخانوں کے متعلق وہٹلی کمیشن کا بیان ہے کہ

"کارخانوں میں کام کرنے والوں کی کثرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہاں چلنے پھرنے کی بھی گنجایش نہیں رہ جاتی۔ زمین کچی اور مرطوب ہوتی ہے، جہاں بیٹھ کر کام کرنا صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جب کام زمین ہی پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے ..... کارخانے میں کمسن لڑکے زیادہ لگائے جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی نازک اُنگلیاں بیڑی لپیٹنے میں زیادہ آسانی کے ساتھ گردش کرتی ہیں۔ بالعموم پانچ یا چھ برس کے بچے کام پر لگا دئے جاتے ہیں۔ دس، بارہ گھنٹے روزانہ بلا کسی رخصت کے کام کرنا پڑتا ہے۔ مزدوری کا اوسط دو آنہ یومیہ کے قریب ہوتا ہے۔ اکثر حالتوں میں تو والدین بیڑی کے کارخانہ والوں کے مقروض ہوتے ہیں اور قرض پاٹنے کے لئے بچوں کو کارخانہ میں داخل کردیتے ہیں"[2]

صنعتی مزدور

بڑی صنعتوں، چائے کے باغات، معدنی ذخیروں اور ریلوے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد (جن کو منظم مزدور کہا جاسکتا ہے) پچاس لاکھ سے اوپر ہے۔ اِن میں ۳۸ لاکھ مزدور روزانہ کام کرتے ہیں اور باقی مزدور بیکار رہتے ہیں جو ملوں کے دروازوں پر اس انتظار میں کھڑے رہتے ہیں کہ شاید کسی کی عوضی پر (جسے کارخانہ کی اصطلاح میں 'بدلی' کہتے ہیں) کام کرنے کا موقعہ مل جائے۔ ۳۸½ لاکھ مزدوروں میں ۱۸½ لاکھ کے قریب صنعتی کارخانوں میں کام کرتے ہیں، دس لاکھ باغات میں، ۲۷½ لاکھ ریلوے کارخانوں میں اور ۲½ لاکھ معدنی ذخیروں میں کام کرتے ہیں۔

---

[1] B. Shiva Rao, The Industrial Labour in India P. 229

[2] Labour Commission Report (1931), Quoted by B. Shiva Rao. Op. cit., P. 231

ذیل کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوگا کہ ملک کی بڑی بڑی صنعتوں میں کتنے مزدور کام کرتے ہیں اور اُن کارخانوں کی کیا تعداد ہے:۔

صنعتوں کے نام	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
ٹکسٹائل (کپڑا بننے کے کارخانے)	۷۵۳	۸۲۷۴۴۱
انجینیرنگ	۸۸۸	۲۲۰۵۸۷
پٹرول وغیرہ اور دھات	۱۴۴	۵۶۱۵۹
اشیاء خوردنی اور تمباکو	۲۹۵۷	۲۵۷۵۸۴
ادویات اور رنگ وغیرہ	۵۱۴	۶۴۵۳۹
کاغذ اور چھپائی	۴۵۴	۴۸۶۲۲
لکڑی، پتھر اور شیشہ	۵۳۲	۸۷۰۶۶
کھال اور چرم سازی	۶۸	۱۰۲۷۶
بورے وغیرہ	۲۷۲۹	۲۱۶۲۳۳
متفرقات	۲۲۲	۵۲۲۸۵
مجموعی تعداد	۹۲۶۱	۱۸۴۰۷۹۲[1]

یہ اعداد و شمار ملک کے بڑے صنعتی کارخانوں اور اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کے ہیں۔ لیکن اگر ہم چھوٹی صنعتوں اور اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی شامل کرلیں تو کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔

ہم ذیل میں صنعتوں اور مزدوروں کے متعلق صوبہ وار تفصیلی اعداد و شمار پیش کرتے ہیں:

صوبہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	نوخیز مزدور	مزدور بچے	مزدوروں کی مجموعی تعداد
مدراس	۱۸۱۸	۱۲۸۷۹۶	۵۰۹۷۹	۹۴۶۸	۵۰۹۷	۱۹۴۳۳۵
بمبئی	۲۴۹۵	۴۰۲۴۴۹	۷۱۵۹۱	۴۱۲۰	۹۴۳	۴۷۹۱۰۳
سندھ	۳۲۲	۲۴۶۰۰	۴۹۴۵	۲۰۳	۱۱۷	۲۹۸۷۵
بنگال	۱۷۳۵	۴۹۵۱۸۳	۵۹۸۵۹	۶۲۷۵	۱۴۷۴	۵۶۲۷۹۱
صوبۂ متحدہ	۵۳۰	۱۴۸۴۰۰	۱۵۱۹	۱۱۵۴	۴۱۲	۱۵۵۰۸۵

[1] یہ اعداد و شمار ۳۵ء کے ہیں۔

صوبہ	کارخانے	مزدور مرد	مزدور عورتیں	نوخیز مزدور	مزدور بچے	مزدوروں کی مجموعی تعداد
پنجاب	۷۸۰	۶۱۴۸۶	۸۴۹۴	۱۴۵۳	۸۳۵	۷۲۲۶۸
بہار	۳۱۱	۸۶۱۳۷	۶۳۸۴	۳۲۶	۱۸۷	۹۳۰۳۴
اڑیسہ	۸۰	۳۱۰۸	۱۳۶۸	۵۳	۱۶	۴۵۴۵
صوبہ متوسط و برار	۷۷۳	۴۱۶۳۱	۱۹۶۴۱	۵۱۵	۱۸۷	۶۱۹۷۴
آسام	۷۶۵	۳۵۵۴۰	۱۰۶۸۱	۳۳۹۴	۱۰۶۲	۵۰۶۷۷
صوبۂ سرحد	۳۰	۱۱۴۴	۳۰	۲	۵	۱۱۸۱
بلوچستان	۱۴	۱۹۸۵	۱۴	۰	۴۷	۲۰۴۶
اجمیر و مارواڑ	۳۵	۱۲۶۱۹	۱۰۴۸	۱۱	۲۰۸	۱۳۸۸۶
بنگلور و کرگ	۱۳	۱۰۱۲	۵۰۷	۱۴	۲۴	۱۵۵۷
دہلی	۷۸	۱۴۹۲۹	۲۶۷	۷۴	۱۲۸	۱۵۳۹۸
مجموعی تعداد	۹۷۴۳	۱۴۵۹۰۱۹	۲۴۰۹۳۲	۲۷۰۶۲	۱۰۷۴۲	۱۷۳۷۵۵[1]

اگر ملک کے منظم و غیر منظم مزدوروں کی صرف تعداد کو پیشِ نظر رکھیں تو "ہم بہ آسانی یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان دُنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک ہے۔ کیونکہ یہاں مزدوروں کی مجموعی تعداد ایک کرور ہوتی ہے جو یورپ کے ملکوں پر بھی بھاری ہے"[2]

مزدور کہاں سے آتے ہیں

مزدوروں کی یہ کثیر فوج مشتمل ہوتی ہے، بیدخل شدہ کسانوں، زرعی مزدوروں اور دیہاتی صنعتوں کے اُن ماہرین پر جن کو مشین نے بے روزگار کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کا مزدور یورپ کے مزدوروں سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ مغربی ملکوں کے مزدور "شہری" ہوتے ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد تو یقیناً دیہات ہی سے آتے رہے ہوں گے، لیکن خود اُن کا دیہات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہندوستان کا مزدور دیہات کو خیرباد کہنے اور شہر میں بس جانے کے بعد بھی "دیہاتی" ہی رہتا ہے ان مزدوروں کو شہری زندگی دلکشی دیہات سے نہیں کھینچ لاتی بلکہ جب افلاس اور بھوک کے مصائب ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں اور دیہات میں گزر بسر کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی تو وہ مجبوراً شہر کا رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۱ء کے لیبر کمیشن کا بیان ہے کہ مزدوروں کے لئے "شہروں میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ جب وہ (مزدور) گاؤں کو خیرباد

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۳۸ء کے ہیں۔

[2] Jathar & Beri, "The History of Indian Economic P. 85

کہتا ہے تو اُس وقت اُس کے پیشِ نظر صرف ضروریاتِ زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ بہت کم صنعتی مزدور شہروں میں رہنے کے لئے طیار ہوں گے اگر دیہات ہی میں اُن کو پیٹ پالنے کے لئے تھوڑا کھانا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر آجائے۔ شہر کی کشش اُن کو اپنی طرف نہیں کھینچتی بلکہ وہ شہر کی طرف ڈھکیلے جاتے ہیں"[۱]

جب یہ دیہاتی شہر میں وارد ہوتے ہیں تو اُن کی حیثیت اجنبی کی ہوتی ہے۔ وہ صرف شہر والوں کے عادات واطوار اور طرزِ بود و باش ہی سے ناآشنا نہیں ہوتے بلکہ وہاں کی زبان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ مسٹر بی۔ شیوا راؤ لکھتے ہیں کہ:

"وہ (مزدور) ایک اجنبی کی طرح بالکل تنہا آتا ہے۔ شہر کے حالات اور وہاں کے ماحول سے وہ قطعاً بے گانہ ہوتا ہے۔ گاؤں سے نکلنے کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ وہ قرض کے بار سے لد جاتا ہے اور قرضخواہ کے تقاضے اُس کا شہر میں رہنا دوبھر کر دیتے ہیں۔ یا اکثر اور وجوہ کی بنا پر وہ گاؤں چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہتا ہے جہاں اُس کا کوئی جاننے والا نہ ہو"[۲]

اس کا نتیجہ بقول مصنفین "ہسٹری آف انڈین اکنامکس" یہ ہوتا ہے کہ:

"آب و ہوا کی شدید تبدیلی، غذا کی خرابی، گنجان آبادی (شہر کی)، گرد و پیش کی عفونت و گندگی اور سب پر بالا عزیزوں کی جدائی — ان سب باتوں کا اُس کی صحت پر بے حد ناگوار اثر ہوتا ہے۔ اور پھر جوئے اور شراب کی بری عادتیں بھی اُس کو لگ جاتی ہیں، جن کا گاؤں میں نسبتاً وجود نہیں ہوتا"[۳]

بھرتی کا طریقہ

ہندوستان کے کارخانوں میں مزدوروں کی بھرتی کا طریقہ بہت تکلیف دہ ہے۔ جو نئے مزدور کارخانہ میں داخل ہوتے ہیں اُن کا داخلہ بالواسطہ نہیں ہوتا اور نہ اُن کی بھرتی کے لئے کوئی افسر ہی مقرر ہوتا ہے۔ کارخانوں کے کارکن نئے مزدوروں کو لانے اور بھرتی کرانے کے لئے اپنے کسی معتمد مزدور کو مقرر کرتے ہیں۔ اس درمیانی مزدور کو کہیں "مقدم" کہیں "مستری" اور کہیں "سردار" کہتے ہیں۔ نو آمد مزدور کو حصولِ ملازمت کے لئے اس درمیانی مزدور کو ایک اچھی رقم بطور رشوت دینی پڑتی ہے جسے مل کی اصطلاح میں "دستوری" کہتے ہیں۔ کلکتہ کے جوٹ کے کارخانوں کی "دستوری" بہت مشہور ہے۔ ملازمت مل جانے کے بعد بھی نیا مزدور اپنی ترقی اور دوسری ضروریات کے لئے اس درمیانی مزدور کا محتاج رہتا ہے۔ وہ مزدوروں کو سود پر قرض دیتا ہے اور اُن کے جھگڑے چکاتا ہے۔ غرض درمیانی مزدور طرح طرح سے اپنے وجود کو مزدوروں کے لئے ناگزیر بنا دیتا ہے۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ بعض جگہوں پر درمیانی مزدور کی رشوت کی رقمیں مجموعی طور پر اُس کی تنخواہ سے چار پانچ گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ رشوت کے سلسلہ میں درمیانی مزدور کے ساتھ ساتھ تنخواہ تقسیم کرنے والا کلرک بھی قابلِ ذکر ہے۔ اُس کی آمدنی بھی خاصی ہوتی ہے۔ ان حالات سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مسٹر کلمین کا بیان ہے کہ

"مرد مزدوروں کی طرح سے عورتیں بھی اِن مشکلات کا یکساں شکار ہوتی ہیں۔ اور بدقسمتی سے اگر کوئی عورت بیوہ ہوئی تو اُس کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے"[۴]

---

۱ Labour Commission Report (1931) P. 4.
۲ B. Shiva Rao, op. cit., P. 189.
۳ Jathar & Beri op. cit., P. 89.
۴ J. H. Kelman, "Labour in India" P. 108

عورتوں کے لئے ایک مصیبت اور بھی ہے مثلاً

"بمبئی کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں میں، اُن شعبوں کی دیکھ بھال کے لئے جن میں عورتیں کام کرتی، اُور سیر عورتیں ہوتی ہیں جن کو 'نائک' کہتے ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ گرے ہوئے طبقہ سے ہوتا ہے، اس لئے اُن کی اخلاقی حالت بھی گری ہوئی ہوتی ہے اور وہ اکثر نوجوان لڑکیوں اور عورتوں پر اپنے اختیار کا بیجا استعمال کرتی ہیں"[1]

لیبر کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اِس چیز پر بہت زور دیا تھا کہ مزدوروں کے داخلہ وغیرہ کے سلسلہ میں درمیانی مزدور کا وجود قطعاً ختم کر دیا جائے۔ اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ مزدوروں کی بھرتی کے لئے ایک افسر مقرر کیا جایا کرے، جو پڑھا لکھا اور نیکدل ہوا کرے اور اُس کا تعلق منیجر سے ہو۔ مگر اس سفارش کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ پورے ملک میں صرف دو کارخانے ہیں جہاں مزدوروں کی بھرتی کے لئے لیبر افیسر کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ ایک ساسون کمپنی (Sassoon Co.) اور دوسرا برما شل کا کارخانہ"[2]

چا کے باغات

ہندوستان کے جن علاقوں میں چا پیدا ہوتی ہے، اُن میں آسام کا علاقہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اہم ہے، ان باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی فراہمی اور بھرتی کے لئے ایک ٹھیکہ دار مقرر کیا جاتا ہے جس کو "سردار" کہتے ہیں۔ یہ سردار مزدوروں کی فراہمی کے لئے ملک کے میدانی علاقوں کا دورہ کرتا ہے جہاں سے وہ بہ آسانی مزدور حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سردار مزدوروں کو چا کے باغات کی دلکشی، کام کی آسانی اور خوشگوار زندگی کے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ یہ باغات صنعتی کارخانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور یہاں کی زندگی زرعی زندگی سے بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے، اگرچہ کچھ ایسے قوانین بنا دئے گئے ہیں جن کی وجہ سے صنعتی مزدوروں اور باغات کے مزدوروں کے حالات میں یک گونہ مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ایک تعجب خیز حقیقت ہے کہ آسامیوں کو باغات میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی اور "آسام کے مزدور تمام کے تمام، بہار اور صوبۂ متحدہ کے رہنے والے ہوتے ہیں"[3]۔ چا کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کو حیرتناک حد تک مزدوری کم دی جاتی ہے۔ انڈین ائیر بک (Indian Year Book) کے مطابق اُن کو حسب ذیل ماہانہ اُجرت ملتی ہے:-

		روپیہ	آنہ	پائی	ماہانہ اُجرت ملتی ہے
آسام	مردوں کو	۷	۳	۵	
"	عورتوں کو	۵	۷	۳	" " " "
"	بچوں کو	۴	۴	۷	" " " "
وادی سورما	مردوں کو	۵	۱۰	۱۱	" " " "
"	عورتوں کو	۴	۱	۱۰	" " " "
"	بچوں کو	۲	۱۲	۹	" " " "

[1] Gather + Beri op. cit., P. 94
[2] The Indian Year Book 1937-38 P. 502.
[3] Pramathnath Benerjee, "A Study of Indian Economies." P. 292
[4] The Indian Year Book 1939-40, P. 541

کام کے گھنٹے

بقول پرماتھ ناتھ بنرجی :

"مزدوروں کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ کام کے گھنٹوں کا ہے۔ ہندوستان میں کام کے گھنٹے محدود کرنے کا سوال ابتداہی سے اُٹھایا گیا۔ ٹریڈ یونین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور بین الاقوامی مزدور کانفرنس نے بھی اِس تحریک کو بہت تقویت پہونچائی ہے"[1]

۱۸۸۱ء سے پہلے ہندوستان میں مزدوروں کے متعلق کوئی خاص قانون ہی نہیں تھا۔ ۱۸۸۱ء میں ایک قانون پاس کیا گیا، جس کی رو سے سات برس کی عمر سے کم کے بچّوں کا کارخانوں میں مزدوری کے لئے داخلہ ممنوع قرار پایا اور بچوں کے سلسلہ میں یہ بھی ایک دفعہ اس قانون میں رکھی گئی کہ سات سال کی عمر سے بارہ سال کی عمر تک کے بچّوں سے کوئی کارخانہ نو گھنٹے سے زیادہ کام نہ لے اور ہر چار گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ آرام کرنے کے لئے چھٹی دیجائے۔

۱۸۹۱ء میں اس قانون میں ترمیم ہوئی۔ اب بچّوں کے داخلہ کے لئے عمر کی قید سات سال سے بڑھا کر نو سال کردی گئی اور نو سال سے بارہ سال تک کے بچّوں کے لئے کام کے گھنٹے نو سے گھٹا کر سات کر دئے گئے۔ عورتوں کے لئے گیارہ گھنٹے روزانہ متعین ہوئے۔ عورتوں اور بچوں کے رات کے وقت کام کرنے کے متعلق بھی کچھ پابندیاں عاید کی گئیں۔

۱۹۱۱ء میں پھر اس قانون میں ترمیم ہوئی۔ اس مرتبہ نو کے اوپر اور چودہ سال سے کم کے بچوں کے لئے کام کے گھنٹے گھٹا کر چھ کر دئے گئے۔ اس ترمیم کے مطابق پارچہ بافی کے کارخانوں میں مردوں کے لئے بارہ گھنٹے روزانہ کام کا اوسط مقرر کیا گیا اور رات کے وقت عورتوں کا کام کرنا ممنوع قرار پایا۔

۱۹۲۲ء میں کارخانوں کے قانون میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اس مرتبہ لڑکوں کے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے داخل ہونے کی عمر بڑھا کر بارہ کردی گئی۔ کام کے گھنٹوں میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ جوان مزدوروں کے کام میں ایک گھنٹہ روزانہ کی تخفیف ہوئی یعنی بجائے بارہ کے گیارہ گھنٹے روزانہ کا اوسط مقرر کیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ کے لئے آرام کا موقعہ دیا جائے۔

۱۹۳۴ء میں بچوں کے کام کے گھنٹے چھ سے گھٹا کر پانچ کر دئے گئے۔ جوانوں کے کام کے اوقات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی صرف اُن کارخانوں کے لئے جو سال کے سال کام کرتے ہیں دس گھنٹہ روزانہ یا ہفتہ میں ۵۴ گھنٹے مقرر کئے گئے۔

ہندوستان میں کارخانے دو طرح کے ہیں ایک تو موسمی اور دوسرا بارہ ماسی۔ موسمی کارخانوں میں مزدوروں کو گیارہ گھنٹے روزانہ یا ہفتہ میں ۶۰ گھنٹے کے اوسط سے کام کرنا پڑتا ہے۔ سوتی کپڑوں کے کارخانے (بہ استثنار چند) روزانہ نو گھنٹے کام لیتے ہیں۔ صرف چند ایسے کارخانے ہیں جہاں ۸½ گھنٹے روزانہ کام لیا جاتا ہے۔

ہندوستانی صنعتی کارخانوں کی یہ بھی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ ہر جگہ کام کے گھنٹوں کا یکساں تعین نہیں ہے۔ بالعموم مزدوروں کو ہفتہ میں ۴۸ گھنٹوں سے لیکر ۵۴ گھنٹوں تک کام کرنا پڑتا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ

---

[1] Paramathnath Banerjee, Op. cit. P. 295.

ملک کے کتنے فیصدی کارخانے کتنے گھنٹے روزانہ کام لیتے ہیں۔

یہ اعداد و شمار ۳۵ء کے ہیں :-

	ہفتہ میں ۴۲ گھنٹے	ہفتہ میں ۴۲ سے ۴۸ گھنٹے تک	ہفتہ میں ۴۸ گھنٹے
مستقل کارخانے			
عورتیں	۷ فیصدی کارخانے	۲۳ فیصدی کارخانے	۳۰ فیصدی کارخانے
مرد	۱۵ " "	۸ " "	۶۷ " "
موسمی کارخانے			
عورتیں	۲۷ " "	۱۳ " "	۶۰ " "
مرد	۳۵ " "	۱۱ " "	۵۴ " "

معدنیاتی کارخانوں میں مزدوروں کے ہفتہ وار کام کے گھنٹوں کے حسب ذیل تفصیلی اعداد و شمار ہیں۔ یہ اعداد ۳۷ء کے ہیں :

مقامات	اوورسیر	کان کن	بار بردار	کاریگر مزدور	غیر کاریگر مزدور	عورتیں
جھریا (بہار)	۴۹ گھنٹے	۴۵ گھنٹے	۴۵ گھنٹے	۴۶ گھنٹے	۴۶ گھنٹے	۴۵ گھنٹے
رانی گنج (بنگال)	۵۰ "	۴۶ "	۱۶ "	۴۸ "	۴۰ "	۴۵ "
گرڈیہ (بہار)	۴۲ "	۴۲ "	۴۰ "	۴۶ "	۴۶ "	۴۴ "
آسام	۴۷ "	۴۶ "	۴۸ "	۴۶ "	۴۸ "	۰ ۰
پنجاب	۴۲ "	۴۹ "	۳۶ "	۴۷ "	۴۳ "	۰ ۰
پنچ ویلی (صوبہ متوسط)	۵۰ "	۴۸ "	۴۹ "	۴۸ "	۵۰ "	۰ ۰
صوبہ متوسط	۴۹ "	۴۸ "	۰ ۰	۴۹ "	۴۹ "	۴۹ "
بلوچستان	۳۵ "	۳۶ "	۳۷ "	۴۰ "	۳۶ "	۰ ۰

اُجرت ——— بدقسمتی سے ہندوستان کے صنعتی یا غیر صنعتی مزدوروں کی آمدنی کے متعلق اعداد و شمار اچھے کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ ۲۱ء میں مرکزی حکومت نے اس سلسلہ میں کام شروع کیا تھا مگر کچھ ایسی صورتیں پیدا ہوئیں کہ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ ہندوستان کی صوبجاتی حکومتوں میں صرف بمبئی کی حکومت نے اس طرف توجہ کی ہے۔ لیکن ابھی یہ چیز پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچی ہے۔

اب تک جو اعداد و شمار شایع ہوئے ہیں اُن کے مطابق حسب ذیل مقامات پر سوتی اور دوسرے کپڑوں کے کارخانوں میں حسب ذیل مزدوری ۱۹۳۴ء میں ملتی تھی:

	روپیہ	آنہ	پائی	اوسط
بمبئی شہر	۱	۱	۱۰	یومیہ
نواح بمبئی	۱	۰	۳	"
اضلاع تھانہ، کلابا اور رتناگری	۱	۰	۳	"
احمد آباد شہر	۱	۵	۷	"
نواح احمد آباد، کیرہ اور پانچ محال	۱	۰	۳	"
بروچ اور سورت	۰	۱۴	۰	"
مشرقی و مغربی خاندیش	۰	۱۲	۰	"
پونا، ناسک اور احمد نگر	۰	۱۵	۷	"
شولاپور شہر	۰	۱۱	۸	"
نواح شولاپور اور ستارہ	۰	۷	۶	"
بیجاپور، دھرواڑ اور کنارہ	۰	۸	۷	"

بنگال کے جوٹ کے کارخانوں میں مختلف طبقہ کے کام کرنے والوں کو ۴۰ روپیہ ماہوار سے ۱۱ روپیہ ماہوار تک ملتے ہیں[1] انڈیا لیگ ڈیلیگیشن رپورٹ کے مطابق ایک کارخانہ میں عورتوں کو دو روپیہ چار آنہ اور مردوں کو تین روپیہ چار آنہ ماہانہ اُجرت ملتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے زیادہ اُجرت احمد آباد کے سوتی کپڑوں کے کارخانوں میں دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک مزدور جو دو کرگھوں پر کام کرتا ہے اس کو ۴۵ روپیہ سے ۵۰ روپیہ ماہانہ تک دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں مزدوری اس سے بہت کم ملتی ہے۔ مثال کے لئے آپ صوبۂ متوسط کو لیں جہاں ایک کرگھے پر کام کرنے والے کو ۱۵ روپیہ اور دو پر کام کرنے والے کو ۳۰ روپیہ ماہوار دیئے جاتے ہیں۔ کانپور میں دو کرگھوں پر کام کرنے والے کو ۳۵ روپیہ سے ۴۰ روپیہ ماہانہ تک دیئے جاتے ہیں

انڈیا لیگ ڈیلیگیشن رپورٹ کا بیان ہے کہ اڑیسہ میں معمولی مزدوروں کو چار آنہ یومیہ اُجرت ملتی ہے اور سرکاری کاموں کے لئے اُن کو نصف اُجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اسی رپورٹ کے مطابق کوئلہ کی ایک کان میں میاں بیوی کو ایک روپیہ دو آنہ یومیہ ملتے ہیں اور ڈھلائی کا نرخ نو آنہ فی ٹن ہے۔ کانپور میں تجربہ کار مزدوروں کو تیس روپیہ ماہانہ سے تیرہ روپیہ ماہانہ تک اُجرت دیجاتی ہے[2]۔

---

[1] ان میں چینی بڑھئی کا کام کرنے والے شامل نہیں ہیں جو اکثر ۹۳ روپیہ ماہوار تک پاتے ہیں۔

[2] India League Delegation Report P 447

ہندوستان کے کارخانوں میں اُجرت تقسیم ہونے کا کوئی ایک وقت متعین نہیں ہے۔ کہیں ہفتہ وار اُجرت تقسیم ہوتی ہے، کہیں پندرہ روزہ اور کہیں ماہوار۔ جس کارخانہ کو جس میں آسانی نظر آئی، اُس نے وہ طریقہ اختیار کر لیا۔ سرکاری قانون کے مطابق ایک مہینہ کے اندر مزدوری تقسیم ہو جانا چاہیئے۔

بعض کارخانوں میں ایک اور بھی ستم ظریفی نظر آتی ہے۔ مثلاً احمد آباد کے کپڑا بننے کے کارخانے کے مختلف شعبوں میں مزدوری تقسیم ہونے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کسی شعبہ میں ہفتہ وار ملتی ہے اور کسی میں پندرہ روزہ یا ماہوار[1]۔

بمبئی میں اُجرت ہر مہینہ کی ۵ تاریخ کو تقسیم ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور کو اپنی اُجرت کے لئے پہلی بار چھ ہفتوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ کارخانہ والوں نے یہ بھی ایک قانون بنا رکھا ہے کہ کم از کم پندرہ روز کی مزدوری وہ روک لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک قانون ہے کہ اگر کوئی مزدور نوکری چھوڑنا چاہتا ہے تو اُس کو ایک مہینے پہلے نوٹس دینی چاہیئے۔ اگر اُس نے بغیر نوٹس کے نوکری چھوڑ دی تو اُس کی تنخواہ ضبط ہو جائے گی۔ کلکتہ کے جوٹ کے کارخانوں میں مزدوری ہفتہ وار تقسیم ہوتی ہے مگر یہاں بھی ایک ہفتہ کی مزدوری ہمیشہ روک لی جاتی ہے۔

احمد آباد کے کارخانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کہیں ہفتہ وار، کہیں پندرہ روزہ اور کہیں ماہوار مزدوری ملتی ہے۔

آمدنی و خرچ

بمبئی میں ایک مزدور گھرانے کی ماہانہ آمدنی ۵۰ روپیہ - ۱ آنہ - ۷ پائی - ہوتی ہے۔
احمد آباد " " " " " " " ۴۴ - ۷ - ۲ " "
شولاپور " " " " " " " ۳۹ - ۱۴ - ۱۰ " "

خرچ کا بھی تخمینہ دیکھئے:

فہرست اشیاء	بمبئی (۱۹۳۲ء)	احمد آباد (۱۹۲۶ء)	شولاپور (۱۹۲۸ء)	کیفیت
غذا پر	۴۶ ؍ ۶۰	۵۷ ؍ ۹۰	۴۹ ؍ ۲۵	آمدنی کا فیصدی حصہ
ایندھن اور روشنی پر	۷ ؍ ۱۱	۷ ؍ ۰۴	۹ ؍ ۶۰	" " " "
کپڑا اور جوتے پر	۷ ؍ ۷۵	۹ ؍ ۴۵	۱۱ ؍ ۸۶	" " " "
کرایہ مکان پر	۱۲ ؍ ۸۱	۱۱ ؍ ۷۴	۶ ؍ ۲۷	" " " "
متفرقات	۲۵ ؍ ۷۳	۱۳ ؍ ۸۷	۲۳ ؍ ۰۲	" " " "
	۱۰۰ ؍ ۰۰	۱۰۰ ؍ ۰۰	۱۰۰ ؍ ۰۰	

مصنفین انڈین اکنامکس، ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس اندازہ کی آمدنی میں زندگی کا کوئی اطمینان بخش معیار قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی

---

[1] The Indian Year Book 1939-40 P. 559

مزدور اپنی آمدنی نہایت عقلمندی کے ساتھ خرچ کرے گا تو بھی یہ یقینی ہے کہ وہ اپنی غذا پر اتنا صرف کر ہی نہیں سکتا جس قدر خرچ کرنا چاہئے ..... اُس کے (مزدور کے) پاس کپڑے اس قدر ناکافی ہوتے ہیں کہ اُن کو موسم گرما کے لئے بھی وافر نہیں کہا جا سکتا۔ تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے اُس کے پاس کوئی رقم نہیں بچتی۔ رہ گیا گھر کا ساز و سامان، سو وہ مشتمل ہوتا ہے، دو ایک بکسوں، متعدد بانس کے ٹٹروں، ایک گاؤں کے بنے ہوئے کمبل، ایک بوسیدہ چٹائی، چند ٹوٹے پھوٹے کھلونوں اور دو ایک مورتیوں پر۔[1]

صوبہ بمبئی کے مزدوروں کی آمدنی اور اُن کے خرچ کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اُس کی روشنی میں مندرجہ بالا بیان کی صداقت کو کون مشتبہ سمجھ سکتا ہے۔ خرچ کے نقشہ میں تعلیم، تفریح اور دیگر ضروریات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ متفرقات کے خانہ میں جو خرچ دکھلایا گیا ہے وہ بیماری، سود اور آمد و رفت کے کرایہ ریل وغیرہ پر خرچ ہوتا ہے۔

کانپور کے سرکاری لیبر آفس (Labour Office) کے صیغۂ اعداد و شمار نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۷ء میں کانپور کے مزدور گھرانوں کی آمدنی و خرچ کا، تحقیقات کے بعد ایک بجٹ مرتب کیا تھا۔ اس تحقیقات کے سلسلہ میں ۲۳۶ گھرانوں کے اعداد و شمار جمع کئے گئے اور پھر آمدنی کے اعتبار سے اُن کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:

آمدنی

آمدنی	پہلا گھرانہ	دوسرا گھرانہ	تیسرا گھرانہ	چوتھا گھرانہ
	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی	روپیہ - آنہ - پائی
فی گھرانہ	۵۳ - ۵ - ۸	۳۵ - ۲ - ۸	۲۰ - ۱۱ - ۳	۱۲ - ۱۰ - ۲
فی مزدور	۲۰ - ۹ - ۵	۲۴ - ۲ - ۰	۱۸ - ۱۰ - ۵	۱۱ - ۵ - ۱۱
فی کس	۶ - ۱۲ - ۷	۷ - ۱۴ - ۲	۶ - ۸ - ۱	۴ - ۳ - ۰

خرچ

اشیاء	پہلا گھرانہ	دوسرا گھرانہ	تیسرا گھرانہ	چوتھا گھرانہ
غذا	۳۹ روپیہ	۴۰ روپیہ	۳۴ روپیہ	۲۵ روپیہ
کپڑا	۰۶ "	۰۶ "	۰۵ "	۰۴ "
جلاون اور روشنی	۰۵ "	۰۵ "	۰۵ "	۰۴ "
کرایہ مکان	۰۶	۰۸	۰۷	۰۶
امور خانہ داری و متفرقات	۲۱	۲۵	۲۰	۱۲

[1] Jacker & Bor op. cit., P. 109.

آمدنی و خرچ کا مقابلہ

گھرانہ	آمدنی	خرچ	بچت (+) یا کمی (−)
	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی	روپیہ آنہ پائی
پہلا	۵۳ - ۸ - ۵	۵۳ - ۵ - ۹	+ ۰ - ۲ - ۸
دوسرا	۳۵ - ۲ - ۸	۳۷ - ۵ - ۱۱	− ۲ - ۳ - ۸
تیسرا	۲۰ - ۱۱ - ۳	۲۲ - ۲ - ۲	− ۱ - ۶ - ۱۱
چوتھا	۲۵ - ۱ - ۳	۲۶ - ۱۰ - ۱۱	− ۱ - ۹ - ۸

کانپور کے مزدوروں کا جہاں تک تعلق ہے، اُن میں صرف پہلے گھرانے کے مزدوروں کی ماہانہ بچت دو آنہ آٹھ پائی ہوتی ہے۔ باقی تین گھرانوں کی آمدنی میں خرچ پورا نہیں پڑتا۔ تقریباً یہی حال ملک کے تمام صنعتی علاقوں کا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں مزدوروں کا مقروض ہونا تعجب انگیز نہیں۔

قرض ان حالات کی موجودگی میں مزدوروں کا مقروض ہونا حیرتناک نہیں ہے۔ اول تو وہ گاؤں ہی سے مقروض آتے ہیں اور پھر شہر میں بھی اُن کی زندگی قرض کے بار کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ حصول ملازمت کے لئے انکو رشوت دینی پڑتی ہے۔ اور یہ رقم قرض ہی لیجاتی ہے اور جب ملازمت ملجاتی ہے تو مہینہ بھر کا خرچ چلانے کے لئے قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرض کی یہ رقمیں بہت کم حالتوں میں ادا کی جاتی ہیں کیونکہ آمدنی اس درجہ قلیل ہوتی ہے کہ اُس میں کسی ایسی بچت کی گنجایش ہی نہیں رہتی جس سے قرض ادا کیا جاسکے۔ مزدور کو شادی بیاہ، موت زندگی اور مہمانداری وغیرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بھی مہاجن ہی کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے — سب سے بڑا قرضہ بنئے کا ہوتا ہے جو ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے مزید منافع لیکر مہینہ بھر کے وعدے پر جنس اور دوسری ضروریات قرض دیتا ہے۔ اگر بنئے کی یہ رقم مہینہ بھر کے بعد ادا نہ کی گئی تو اُس پر سود اور در سود چلنے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنیا سود ۵۰ فیصدی کے حساب سے وصول کرتا ہے۔ تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ ہر مزدور کے قرض کی رقم اُسکے تین ماہ کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ مزدوروں کے قرض کا ذکر کرتے ہوئے مصنفین انڈین اکنامکس لکھتے ہیں:

"مزدور کی زندگی کا بیشتر حصہ قرض کی حالت میں گزرتا ہے اور اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مزدوروں کا تین چوتھائی حصہ قرض کے بار سے لدا رہتا ہے اور قرض کی یہ رقم انکی تین مہینہ کی مزدوری کے برابر ہوتی ہے۔ قرضہ کی عدم ادائیگی ایک عام وبا ہے۔ اس کی وجہ اتفاقات اور غربت سے قطع نظر، خود مہاجن بھی ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ قرض ادا نہ ہو اور قرضہ کی معمولی رقم بڑھکر دونی چوگنی ہوجائے۔"

یہ ہے ہندوستان کے مزدوروں کی حالت جنکی محنت پر یہاں کی صنعت کا انحصار ہے — اس میں شک نہیں کہ جہاں تک صنعتی اداروں کا تعلق ہے وہ کافی مالدار ہیں، لیکن ملک کی عام اقتصادی حالت برستور خراب چلی آرہی ہے اور برابر خراب ہوتی چلی جائے گی جب تک مزدور طبقہ کی تعلیم، صحت اور آمدنی کو اس قابل نہ بنا دیا جائے کہ وہ بھی انسانی برادری میں اپنی انفرادی و اجتماعی اہمیت کو محسوس کرنے لگے — ایک ملک کی خوشحالی کا معیار یہ نہیں کہ دولت چند افراد میں محدود ہوکر رہ جائے، جبکہ اس کا صحیح معیار یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی ضروریات فراہم کرنے میں تمام ممکن آسانیاں حاصل ہوں اور بقول سر ظفر اللہ خاں، یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ہم سود لینے والے اداروں کو بالکل ختم نہ کردیں —

محمد عتیق صدیقی

یونانی علم الاصنام

یونانِ قدیم کی تاریخ بڑی دلآویزیوں کا مجموعہ ہے۔ اسکے ہر صفحہ پر شان وشوکت، حسن وعشق اور دبدبہ وجلال کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس کا ادب آج بھی پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لئے دلکشی کا سامان رکھتا ہے۔ فیڈائس، ہومر، سافوکلس، ارسطو، سقراط، افلاطون، ہروڈوٹس، ارکیمیدس کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ فنونِ یونان کے مظاہرِ لطیف آج بھی دُنیا سے اپنے حسن وعنائی کی بدولت خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اس کی آب وہوا آج بھی نشہ بخش، کیف آور اور نشاط انگیز ہے۔ غرض اس کا ہر ہر حصہ آج بھی باوجود ہزار انقلاب زمانہ کے حد درجہ جاذب قلب ونظر ہے اور اُسوقت تک رہے گا جب تک انسان کا جمالیاتی ذوق فنا نہیں ہوجاتا۔

یونان قدیم کا لفظ ایک برقی اثر رکھتا ہے جو ہمارے تخیل کو فوراً جگمگا دیتا ہے اور اس لفظ کا خیال کرتے ہی دو ہزار سال کا زمانہ اپنی تمام حیرت سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور اس میں عقل تخیل کی ایسی ایسی سحر کاریاں نظر آتی ہیں کہ ہماری موجودہ تہذیب بھی، باوصف اپنی درخشانیوں کے انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

قدیم یونان کی تہذیب میں تخیل کی بڑی رنگ آمیزی ہے۔ اس کی قدامت وعظمت کی ساری عمارت علم الاصنام پر تعمیر کی گئی ہے۔ یونانیوں کے نزدیک کاشتکار کا بیج بونا، ملاح کا کشتی کھینا، شاعر کا شعر کہنا، موسیقی کا نغمہ الاپنا، اور سپاہی کا دادِ شجاعت دینا، یہ سب دیوتاؤں ہی کی کارفرمائی تھی۔ سینۂ عشق میں محبت کی گرمیاں، بارگاہِ حُسن میں عشق کی نیازمندیاں اور رسوائیاں وصل کی آرزوئیں، ہجر ومفارقت کی بے چین راحتیں، وصال کی مسعود ساعتیں اور شکیب وصبر کی ناکام حسرتیں، یہ سب یونانیوں کے نزدیک دیوتاؤں ہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ غرض یہ سارا کارگہِ عالم انھیں کے اشاروں پر چلتا تھا اور فضائے بسیط کی ہر شے ایک مافوق البشر ہستی سے وابستہ تھی۔

یونانی اساطیر پر بحث کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ہم صنمیات کے بعض پہلوؤں پر غور کرلیں۔ ان میں دیوتاؤں کے بعض افعال تو ایسے ہیں جو فہم انسانی کی دسترس سے باہر نہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جن کو عقلِ سلیم آسانی سے تسلیم نہیں کرسکتی مثلاً یونانیوں کی "زہرۂ عریاں" اچھی اور بُری دونوں خصوصیات کی حامل ہے اور جتنی وہ دلکش ہے اتنی ہی جراحتِ دل بھی ہے۔ زیوس جس کا مرتبہ خداوندانِ اولمپس میں بہت بلند ہے، اگر وہ بدی کو روکتا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتا ہے تو ہیرا کے ساتھ بدسلوکی بھی کرتا ہے اور دوسروں کی جوان لڑکیوں کو "بُری نگاہ" سے بھی دیکھتا ہے۔ بعض دیوتا عجیب عجیب شکلیں رکھتے ہیں۔ کوئی آدھا انسان ہے اور آدھا حیوان۔ کوئی زاہد ومتقی بھی ہے اور رہزنی اور بدکاری کو بھی اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ انھیں باتوں کو دیکھ کر میکس ملر کہتا ہے کہ علم الاساطیر کا ایک حصہ بالکل "احمقانہ اور غیر مہذب" ہے اور

اس کا اس دور میں جبکہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، کوئی معقول اور قطعی جواز پیش کرنا نہایت مشکل ہے۔

ازمنہ قدیمہ میں علم الاصنام کے اس لغو عنصر کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں اور بعض لوگوں نے اس کی عقلی تعبیر کرنا چاہی زنافینز (Xenophanes) نے چھٹی صدی (ق۔م) میں اساطیر نگار شاعروں پر سخت تنقید کی اور انکی کوششوں کو بادپیمائی سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد فلسفیوں نے اساطیر میں طبیعیاتی نکات ڈھونڈھنے شروع کئے اور مختلف دیوتاؤں کو مظاہر قدرت ثابت کیا۔ بعض فلسفیوں نے کہا کہ یہ محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ تمثیل اور مجاز کے پردے میں اخلاقی مسائل ہیں جو انتہائی خوبی اور صناعانہ تکمیل کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کردئے گئے ہیں۔ لیکن ان دونوں نظریوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کیا اس عہد قبل از تاریخ میں جب علم الاصنام کا آغاز ہوا، انسان اتنا صاحب عقل و ہوش تھا اور وہ طبیعیات اور اخلاقیات سے اتنا باخبر ہوگیا تھا کہ اس نے ان دقیق مسائل کو اس طرح تمثیلاً رواج دیدیا۔ اس کا جواب تمام علوم جدیدہ نفی میں دیتے ہیں۔

یومرس (۳۱۶ ق۔م) کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کی کہانیوں میں انسان کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہ تمام دیوتا درحقیقت معمولی گوشت پوست کے انسان تھے جن کو بعد میں تخئیل کی رنگ آمیزی، بطل پرستی اور جوش غلو نے دیوتا اور خداوند بنادیا (Lactantius) اور سینٹ آگسٹن بھی اسی رائے سے متفق ہیں اور اس کے مزید جواز میں اس قسم کی باتیں پیش کی ہیں کہ اہل کریٹ، زیوس کی قبر سے واقف تھے اور اہل فونیشیا اپنے جنگجو مشاہیر کی قبروں پر خون کا چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ الغرض یونانی مفکرین نے اساطیر کو اخلاق۔ طبیعیات۔ مذہب اور تاریخ کی روشنی میں دیکھا۔ تھیجنیس (Theagenes) نے ہومر کی اساطیری شاعری میں قدرت کے کارناموں کی جھلک محسوس کی۔ پورفیری نے اساطیر کو اخلاق و مذہب کی داستان سمجھا اور ارسطو نے علم الاصنام کو واضعان قانون کی ایجاد قرار دیا تاکہ وہ عوام سے اپنے فیصلوں کو منوا سکیں۔ یومرس نے اسے انسانی تاریخ کا جزو بتلایا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں طامس ٹیلر نے علم الاصنام کو تمثیل سے تعبیر کیا اور بتلایا کہ اس میں مذہبیات کے بڑے بڑے رموز پنہاں ہیں۔ لیکن لابک (Lobeck) نے اس خیال کی تردید کی اور بتایا کہ اس قسم کا تجزیہ انسانی ارتقاء سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ موجودہ زمانہ میں عقلی علوم کی واقفیت نے علم الاساطیر کے سمجھنے میں بڑی مدد دی ہے۔ لسانیات، بشریات، انسان کے ارتقاء اور اداروں کی تاریخ نے اب ہمارے لئے بڑی سہولتیں پیدا کردی ہیں اور موجودہ تحقیق بڑی حد تک اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ علم الاساطیر انسان کے ارتقاء، نطق اور خیال کا مجموعہ اور فسانہ ہے۔ لیکن ماہرین اساطیر ابھی ایک مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں، ایک گروہ، جس کا سرخیل میکس لر ہے، یہ کہتا ہے کہ علم الاصنام "زبان کی عدالت" ہے یعنی یہ اُن بے سمجھے ہوئے لفظوں اور خیالوں کا مجموعہ ہے جو اسی طرح زبان میں باقی رہ گئے ہیں اور اُن کے اصلی معنی معدوم ہوچکے ہیں۔ اگر ہم فیلالوجی کے ذریعہ اتحادِ لسانی کا راز معلوم کرلیں تو ہم پھر اساطیر کے اصلی مفہوم سے باخبر ہوجائیں گے لیکن یہ اگر ہمیں واقفیت حاصل ہوجائے تو بھی چنداں فایدہ نہیں۔ اس لئے کہ بہت سے خرافاتی قصے مختلف قوموں میں بالکل ایک ہیں۔ آریوں کا بہت سا اساطیری علم اہلِ آسٹریلیا، اسکیمو، افریقہ کی جھاڑیوں کے رہنے والے وحشیوں اور جزائر سلیمان کے باشندوں سے ملتا جاتا ہے۔ اس لئے بالفرض اگر ہمیں یہ معلوم بھی ہوجائے کہ زیوس سے مطلب آسمان

اور اگنی سے مراد آگ ہے، تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج جتنے قصے زیوس اور اگنی سے متعلق ہیں وہ سب شروع میں آسمان اور آگ ہی سے متعلق تھے۔ اس کے علاوہ وحشیوں کے نزدیک سورج، چاند اور ہوا وغیرہ کا مفہوم، ہمارے مفہوم سے بالکل مختلف تھا۔ اگر ہمیں دو دیوتاؤں کے ابتدائی معنی معلوم بھی ہو جائیں تو یہ کیا یقین ہے کہ جو مفہوم اس لفظ سے ہم نے سمجھا ہے وہی اِن لوگوں کے ذہن اور دماغ میں رہا ہو۔

عہدِ جدید کے ماہرینِ اساطیر میں میکس ملر کا نام بہت مشہور ہے جو لسانی ادارۂ فکر کا سالک اور رہنما سمجھا جاتا ہے لیکن تحقیقاتِ جدیدہ کی بدولت اب تاریخی یا بشری گروہ کو زیادہ قوت حاصل ہو گئی ہے اور رفتہ رفتہ اِسی جماعت کے خیالات اہمیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

علم الاصنام کے متعلق اس تشریحی اور توضیحی بحث کے بعد اب ہم یونانی دیوتاؤں کی خصوصیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یونانی دیوتا اگرچہ ازلی نہیں تھے لیکن عموماً ابدی اور غیر فانی سمجھے جاتے تھے۔ اِن کے متعلق اہلِ یونان کا یہ خیال تھا کہ وہ شراب اور ربانی غذا کی وجہ سے زندہ رہتے تھے لیکن عمر، اُن کی صحت پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یونانی اپنے دیوتاؤں کو ہمہ داں، ہمہ بیں اور قادرِ مطلق سمجھتے تھے، لیکن اُن کے مراتب میں بڑا فرق تھا۔ ان کی طاقت غیر معمولی سمجھی جاتی تھی۔ یہ لوگ ہر کام آناً فاناً کر سکتے تھے۔ یہ نہایت عقلمند اور ذی فہم سمجھے جاتے تھے۔ گمراہوں کو عقل بتانے والے بھی یہی تھے۔ ان کی سرشت میں انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور یہ میرے اعمال کی جلد یا دیر میں سزا ضرور دیتے تھے۔

یونانی دیوتا عام طور پر سب ہی لوگوں سے تھوڑی بہت محبت کرتے تھے، گناہگار بھی کفارہ دینے کے بعد اُن کے الطاف و کرم کے مستحق ہو سکتے تھے۔ افراد میں جب دولت کی کثرت ہو جاتی تھی تو دیوتاؤں کے حکم سے اُن پر شیطان کا سایہ کر دیا جاتا تھا۔ معاشرتی فرائض اور قانونی کارروائیوں کی دیکھ بھال خاص طور پر دیوتاؤں کے سپرد ہوتی تھی۔

یونانی دیوتا بعض اوقات لوگوں کے گھر پر بھی جاتے تھے۔ لڑائیوں میں شرکت کرتے تھے اور کبھی کبھی خواب میں بھی نظر آتے تھے۔ وہ آدمیوں ہی کی سی وضع قطع رکھتے تھے اور درد و دُکھ سب کچھ محسوس کرتے۔ اس طرح لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں اور ہم میں کچھ باتیں مشترک ہیں اور ہماری آواز اُن تک پہونچ سکتی ہے لیکن جہاں تک صفات کا تعلق ہے وہ ان میں عام انسانوں سے حد درجہ بلند اور افضل ہوتی تھیں۔ ماہرینِ فن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی تھی کہ اُن کے بے مثل مجسمے تیار کر سکیں چنانچہ فیڈائس کا طیار کیا ہوا مجسمۂ زیوس عجائباتِ روزگار میں شمار کیا جاتا ہے۔

یونانی متعدد خداؤں کے قایل تھے۔ اُن کے نام علم الاصنام کی ورق گردانی کر ڈالیے۔ آپ کو کہیں بھی واحد اور ازلی خدا کا تصور نہیں ملے گا۔ یونانی دیوتا تخلیقِ عالم کی ذمہ داری سے بھی بری تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ یونان ماضی سے زیادہ حال کی فکر کرتے تھے۔ اسی لئے دیوتا صرف موجودہ نظام کے قیام، بقا اور تغیر و تبدل سے وابستہ تھے اور ماضی میں کیا ہوا اور کیوں ہوا، اس سے انھیں کچھ بحث نہ تھی۔

یونانیوں میں بعض دیوی دیوتا ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ڈائن (Dione) ہیرا۔ ڈمیٹر اور گائیا (Gaea) اس کا شاید سبب یہ ہے کہ عہدِ عتیق میں یونانیوں کے قبیلے الگ الگ تھے۔

جغرافیائی دقتوں کی وجہ سے ان میں آپس میں میل جول نہیں تھا، لیکن بعد میں جب اتحاد اور ایتلاف ممکن ہو سکا تب بہت سے دیوی دیوتا رل مل گئے یا آپس میں مدغم ہو گئے۔

علم الاساطیر کو سمجھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ یہ قصے کن حالات کی پیداوار ہیں اور ابتدا میں اس قوم کی کیا حالت تھی جس سے یہ افسانے منسوب ہیں۔ ابتدا میں قوم کا تخیل، فرد کے آغاز شباب کے تخیل کی طرح، نہایت رنگین اور دلکش ہوتا ہے اور اس وقت جتنی معلومات کی کمی ہوتی ہے اتنی ہی تصورات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ گرد و پیش کے مظاہر قدرت، ذہن اور دماغ پر برا اثر ڈالتے ہیں اور اس کے حواس، مناظر و مظاہر کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کان پر بجلی کوندتی ہے تو وہ محو فزدہ ہو جاتا ہے۔ جب سورج صبح کو مسکراتا ہوا نکلتا ہے تو وہ مسرور ہو جاتا ہے۔ رات کی بھیانک خاموشی اسے پراسرار اور پرخوف معلوم ہوتی ہے جب موت اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ آکر وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے تو وہ مبہوت اور ششدر رہ جاتا ہے۔ قدیم انسان اپنے ہی سے ان سب چیزوں کا اندازہ لگاتا ہے اور بعض وقت اپنی ہی خصوصیات سے ان مظاہر کو متصف کر دیتا ہے۔ بجلی کی کڑک سن کر وہ اسے شیر کی چنگھاڑ سے تشبیہ نہیں دیتا اس لئے کہ اس صورت میں وہ اپنے ڈر اور خوف کا ازالہ شیر سے نہیں کر سکتا اور نہ اس کے سامنے اظہار نیازمندی کر سکتا ہے اس لئے اس نے اس سے تصور ایک ایسے انسان اعلیٰ کا قایم کیا جس میں تمام بشری صفات اس انسان سے بدرجہ احسن موجود ہوں۔ جیسے جیسے تہذیب و تمدن بڑھتا گیا اس "خداوند" میں صفات اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتی گئیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل جن مظاہر فطرت نے انسان کو متاثر کیا وہ اس قسم کی چیزیں تھیں جیسے موسم کی تبدیلیاں یا روز و شب کا تغیر۔ اسی لئے صنمیات کے ابتدائی دور میں ایسے ہی دیوتاؤں کا ذکر ہے جو فضائے سماوی سے متعلق ہیں۔

اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں انسان نے قدرت کو دیکھ کر ایک ایسے نظام کا اندازہ کیا جس میں ترتیب اور پابندی ہے۔ اُسے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ کوئی طاقت مارنے اور ختم کرنے والی بھی ہے اور ہنگامی تبدیلیوں کے باوجود ایک مستقل ضابطہ ہے جس کے ماتحت نظام قدرت چل رہا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ موت و حیات کا یہ سلسلہ اسی طرح رہے گا اور رات کی تاریکی کے بعد اسی طرح دن نکلے گا۔ جیسے جیسے انسان کی شعوری اور تمیزی قوتیں بڑھتی گئیں اور انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا دوسرے مظاہر کی تحقیق ہونے لگی اور ان نئی چیزوں کو نئے دیوتاؤں سے منسوب کر دیا گیا۔ یا پچھلے دیوتاؤں کے دائرۂ اثر کو بڑھا دیا گیا۔ خداوندانِ نو کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ قدرت میں ایک کشمکش اور مجادلہ نظر آتا تھا اور انسانِ قدیم نے اس کو بہتر اور آسان سمجھا کہ اسے دیوتاؤں کی باہمی آویزش سے منسوب کیا جائے۔ اس اختلاف کے ساتھ ساتھ اس نے ایتلاف اور اتحاد بھی دیکھا اور بالکل اسی طرح اس کی بھی تعبیر کر لی۔ نمی اور گرمی کو اس نے دیوتاؤں کی شادی بتلایا اور سورج اور چاند کو بھائی بہن۔

کثرتِ اصنام کی موجودگی میں ایک بڑے اور سچے خدا کا تصور بعد کی پیداوار ہے جبکہ انسانی شعور زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ آریہ لوگوں کو خدائے واحد کا احساس تھا۔ اسی طرح یونان میں بھی ایک ایسے مقتدر اور اعلیٰ دیوتا کا تصور پیدا ہو گیا تھا جس کے سامنے دوسرے دیوتا معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کی ایک بڑی جماعت آسمان و زمین کے ہر شعبہ میں ایک "خداوند" کو دیکھتی تھی اور اسی سے اس شعبہ کی تمام چیزوں کو متعلق کر دیتی تھی۔ مختلف اوقات

میں لوگ انھیں سے رجوع کرتے تھے۔ اور اظہار تشکر یا امداد کے لئے انھیں کے آستانہ پر جبہ سائی کے لئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ عبادت گاہیں، معبد، مندر اور قربان گاہیں تعمیر ہوگئیں۔ مجسمے طیار ہوگئے اور حسین و جمیل بت تراشے گئے۔ بعض اصنام کی پرستش خاص موسموں میں ہوتی تھی اور بعض دیوتا خاص لوگوں میں مقبول تھے مثلاً جہازرانوں اور ملاحوں کا خاص تعلق بحری دیوتاؤں سے تھا لیکن بڑے بڑے دیوتا تمام ملک اور قوم سے متعلق تھے اور وہی اتحاد اور یگانگت کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ اپالو کو سروشِ غیبی سمجھا جاتا تھا اور اس کے دارالاستخارہ کے دانشمندانہ فیصلے ہر فردِ بشر کے لئے آیت و حدیث کا درجہ رکھتے تھے۔

یونانیوں کے معبود اعظم زیوس اور دوسرے بڑے بڑے دیوتاؤں کا مسکن اولمپس پہاڑ تھا۔ جہاں اسی عالم آب و گل کا ایک پرتو نظر آتا تھا۔ دیوتا اور دیویاں انسانوں ہی کی طرح رہتی سہتی، چلتی پھرتی اور لڑتی جھگڑتی تھیں۔

دیوتاؤں کی خدمت میں قربانی اور نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ یونانیوں اور رومیوں میں اس کے دو طریقے تھے بعض موقعوں پر پھل۔ کیک اور شراب نذر کی جاتی تھی اور بعض موقعوں پر جانور کو قربان کرتے تھے۔ اسے آراستہ کرکے اور ہار وغیرہ پہنا کر قربان گاہ تک لے جاتے تھے اور بہت سی رسموں کے بعد اسے ذبح کرتے تھے۔ اس کے گوشت کا کچھ حصہ قربان گاہ کی آگ پر جلایا جاتا تھا اور یہ خیال تھا کہ اس کی بُو دیوتاؤں کو مرغوب ہے۔ اس کا بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جو شخص اس تمام رسم کو ادا کرے وہ نیک کردار اور پاک باطن ہو گناہگار کی قربانی بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی تھی۔ جانور کے متعلق یہ شرط تھی کہ وہ نہایت تندرست ہو لیکن اس کی عمر، رنگ اور جنس دیوی دیوتاؤں کی مناسبت سے انتخاب کی جاتی تھی۔ صبح کا وقت آسمانی دیوتاؤں کی قربانی کے لئے، اور شام کا، عالم اسفل کے دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھا۔ موخرالذکر دیوتاؤں کو پورا جانور نذر کیا جاتا تھا۔ قربان گاہ کی آگ بڑی متبرک سمجھی جاتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ اس کے لئے ایسی لکڑی جلائی جائے جو صاف روشنی دے۔

شروع زمانہ میں انسانوں کی بھی قربانی ہوتی تھی، اس کے لئے قربانی کرنے والے کا کوئی قریبی عزیز یا دوست انتخاب کیا جاتا تھا۔ اِن مواقع پر دیوتا اپنی رائے سے کسی "غیب داں" کے ذریعہ آگاہ کر دیتے تھے۔ عام طور پر قربانی ایک قسم کی نذر تھی جو ایک شخص اظہار تشکر و نیاز مندی کے طور پر یا کسی گناہ کے کفارہ کے لئے بلا تحریک غیر اپنی خوشی سے دیوتاؤں کی خدمت میں پیش کرتا تھا اور دیوتا اس کے متمنی و متوقع رہتے تھے۔ اور جو اس معاملہ میں کوتاہی کرتا تھا اسے سزا دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے بعض نذرانے وقت مقررہ پر پیش کئے جاتے تھے، کسان کٹائی کے وقت، گلہ بان، گلہ میں نئے بچوں کی پیدائش کے موقع پر، تاجر منافع کی وصولیابی اور سپاہی مالِ غنیمت ملنے پر نذرانہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی قربانی یا نذر کسی لڑائی یا واقعہ کی یادگار یا کسی معاہدہ کی پختگی کے لئے بھی پیش کی جاتی تھی۔

عموماً پرہیزگاری، شکرگزاری یا گناہ گاری کی وجہ سے نذر یا قربانی دیجاتی تھی۔ اسی وجہ سے تقریباً سب لوگ عبادت کرنے اور مندروں وغیرہ میں جانے کے عادی تھے۔ صبح شام، کھانا کھانے کے درمیان، مجالس یا عدالتوں کا کام شروع کرنے سے قبل ایک نہ ایک دیوتا کی عبادت یا تعریف کی جاتی تھی۔ اگر اس موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص دیوتا کا نام نہ لیا گیا تو تمام دیوتاؤں سے دعا مانگ لی جاتی تھی۔ جب ایک مخصوص دیوتا کو خطاب کیا جاتا تھا اسوقت بھی یہ جملہ بڑھا دیا جاتا تھا کہ

"اے بلند مرتبت اصل نام کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟" تاکہ کوئی دیوتا ناراض نہ ہو جائے۔ اسا کلس، ایک دُعا میں لکھتا ہے:

"اے خداوند زیوس ——— تو جو کچھ بھی ہو ——— اور تو جو بھی اپنا نام پسند کرے ———
ہم تجھی سے رجوع کرتے ہیں ——— اور تجھی سے دعا مانگتے ہیں"

جب بحری دیوتاؤں سے دعا مانگی جاتی تھی تو دُعا مانگنے والا سمندر کی طرف اپنا ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اور جب نیچے کی دنیا کے دیوتاؤں کو رجوع کرنا ہوتا تھا تو وہ شخص اپنے ہاتھ زمین پر مارتا تھا۔ اور جب مندر میں دعا مانگی جاتی تھی تو بت کے سامنے نیازمندانہ طریقہ سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی اور تکلیف کے عالم میں ملتجی زیتون کی شاخ لے کر پہونچتا تھا۔ یا ایک لکڑی پر اون لپیٹ کر "بارگاہ خداوندی" میں آتا تھا۔ اور دیوتا کے قدموں سے لپٹ جاتا تھا۔ فیثاغورث نے اپنے معتقدین کو زور سے دعا مانگنے کی تلقین کی تھی لیکن اس کا رواج نہ ہوا۔

بعض وقت تو دعائیں تختیوں پر لکھکر یا بند کرکے اور مہریں لگا کر دیوتا کے مجسمہ کے قریب رکھ دی جاتی تھیں تاکہ کسی انسان کو یہ خبر نہ ہو کہ کیا دعا مانگی ہے۔ ایک دُعا کا نمونہ ذیل میں درج ہے:۔

زیوس! اے معبود!! ——— ہمیں سب کچھ دے ——— جو اچھا ہے ———
چاہے ہم اسے مانگیں یا نہ مانگیں ——— اور اے معبود! ——— جو بُرا ہے ——— وہ ہمیں نہ دے ———
چاہے ہم اسے طلب ہی کیوں نہ کریں۔

اِن مذہبی رسوم کے علاوہ اہلِ یونان استخارہ گاہِ ڈلفی کے فیصلوں پر بڑا بھروسہ اور ایمان رکھتے تھے اور دیوتاؤں کے فیصلوں کا علم کئی طرح کے شگونوں اور علامتوں سے حاصل کرتے تھے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا تھا کہ اوپر، چڑیاں کس جانب اُڑ رہی ہیں کاہن شمال کی جانب منہ کرکے کھڑا ہوتا تھا۔ اُس وقت اگر چڑیاں دائیں جانب اُڑ رہی ہوں تو یہ اچھا اور نیک شگون سمجھا جاتا تھا اور اگر بائیں جانب، تو یہ بری علامت سمجھی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جانور ذبح کیا جاتا تھا اور اس کی انتڑیاں دیکھی جاتی تھیں اگر وہ صحیح ہوتی تھیں تو اُسے دیوتاؤں کی خوشی اور سازگاری کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ دیوتا اپنی رائے کا اظہار خواب میں بھی کر دیتے تھے۔ بجلی کا کوندنا۔ زلزلہ کا آنا، چاند یا سورج گہن پڑنا۔ ستارہ کا ٹوٹنا۔ یہ سب علامتیں تھیں جن سے دیوتاؤں کی رائے معلوم ہوتی تھی۔ تعبیر دینے والوں کا ایک الگ طبقہ تھا جو کاہن کہلاتا تھا۔

اہلِ یونان اپنے بعض دیوتاؤں کے لئے کچھ خاص کھیل اور جلسے بھی کرتے تھے۔ جب یہ کھیل ہوتے تھے اُس زمانہ میں لڑائی بند کر دی جاتی تھی اور راہ گیروں کو دشمن کے ملک سے بھی نکلنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ان جشنوں اور تہواروں کے نام المپین، پائی تھین، نی مَن اور اسٹھمین تھے۔ اول الذکر تہوار المپیا کی وادیٔ ایلس میں ہر پانچویں سال منعقد ہوتا تھا اس میں عموماً کشتی، گھونسے بازی، جانوروں، رتھوں وغیرہ کی دوڑ کے مظاہرے ہوتے تھے۔ اس میں کامیاب ہونے والے کو صرف زیتون کا ایک ہار دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی لوگ بڑی قدر کرتے تھے اور دور دور سے سفر کرکے اس میں شرکت کے لئے آتے تھے۔ شہر کے آدمی جیتنے والے کی عزت افزائی کے لئے ایک مجسمہ نصب کروا دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے مجمعوں میں شاعر یا مصنف اپنی تصنیف سے بھی سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔

پائی تھین کا تہوار ہر پانچویں سال اپالو کی عقیدت میں ڈلفی کے آس پاس منعقد ہوتا تھا۔ یہ نور اور موسیقی کا خدا

سمجھا جاتا ہے۔ اس مقابلہ میں گانے اور ورزشی کھیل ہوتے تھے اور جیتنے والے کو لارل نام ایک خاص پودہ کی پتیوں کا ہار عطا کیا جاتا تھا۔ نی مَن کے کھیلوں میں جو زیوس کی خوشنودی کے لئے منعقد کئے جاتے تھے، جیتنے والے کو عشق پیچاں کا ہار دیا جاتا تھا۔ استھمین کا جلسہ ہر تیسرے سال پوسی ڈن کی یادگار میں کیا جاتا تھا۔ اور اس میں صنوبر کا ہار طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں ہماری جو کچھ معلومات ہے وہ روایات، آثار، اور ادبیات کی بدولت ہم تک پہونچی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یونانی جن دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اُن کی خصوصیات اور اوصاف کے متعلق عوام کو کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں دیجاتی تھی۔ پروہت اور کاہن ہوتے تھے لیکن اُن کا فرض ادائیگی رسومات کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ اسی وجہ سے یونانی اساطیر میں کافی گڑبڑ اور ابتری ہے۔ سقراط کو اس بات کی حیرت تھی کہ زیوس جو ایک ہی دیوتا ہے اس کے ہزاروں نام کیوں ہیں

ہم اساطیری معلومات، قدیم لٹریچر کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ شاعروں، مورخوں اور فلسفیوں وغیرہ کی تصانیف علم الاصنام کے متعلق نہایت دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ آثار قدیمہ بھی ہمارے لئے معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اس زمانہ کے مجسمے، مصوری و سنگ تراشی کے نمونے، منقش برتن، کھُدے ہوئے قیمتی پتھر، اور سکے ہماری مذہبی اور اساطیری معلومات میں بیحد اضافہ کرتے ہیں اور آج اِس علم کے متعلق ہمیں جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ ادبیات اور آثار ہی کا طفیل ہے۔

علم الاصنام کے اس حلقۂ دام خیال میں غالباً شدید عقلیت پسند لوگوں کو سوائے توہم پرستی یا اسلاف پرستی کے اور کچھ نظر نہ آئے لیکن حساس دل و دماغ رکھنے والے اس آئینہ میں حیات انسانی کا پرتو دیکھیں گے اور اس میں بہت سی ایسی چیزیں پائیں گے جو زندگی کی تلخیوں کے لئے انگبین کا کام دے سکتی ہیں جہاں اس میں فکر و خیال کے رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں وہاں لغویات اور مزخرفات کے کانٹے بھی ہیں۔ انسانی زندگی میں بھی تو معقولیت اور غیر معقولیت دونوں ہی چیزیں ملتی ہیں۔ ایچ۔ ڈیوس نے معقول زندگی کی آرٹ کے نقطۂ نظر سے، بڑی عمدہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے "ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سانسوں کی آمد و شد یا اس کی مجموعی تعداد پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ حقیقتاً اس تعداد پر کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا خارج ہو، یہ دونوں صورتیں خواہ کسی جذبۂ محبت کے ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر چیز کو دیکھ کر عمل میں آویں"۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملے گا جو علم الاصنام یا انسانی دماغ کے اس عہدِ طفولیت کے افسانہ میں حُسن اور دلکشی نہ محسوس کرتا ہو۔ اندر کے اکھاڑے، کرشن کی سبھا، زیوس کے پرستان اور باخوس کی مجلس میں آج بھی زندگی کی ناخوشگوار حقیقتیں پناہ گزیں ہوسکتی ہیں۔ ادبیات کی افسوں کاری آج تک اسی علم الاساطیر کی مرہونِ منت ہے۔ ہومر کی ایلیڈ ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن اور فردوسی کا شاہنامہ آج بھی فقید المثال کارنامے سمجھے جاتے ہیں اور انسان، اِس عہد عقل و ہوش میں بھی، تخیل کی انھیں موجوں سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔ اے

نگاہِ بازگشت

(مسلسل)

۲۱ - فراقؔ گورکھپوری

حضرت فراقؔ گورکھپوری اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے مشاق نہیں کہے جا سکتے مگر حُسنِ شاعری کی وجہ سے بہت سے مشاقانِ سخن پر فوقیت رکھتے ہیں اور بقول محترم مدیر "نگار"

"اُن کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ :-

"ہمیں اُس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے" فراقؔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں آپ ادیب بھی ہیں اور ماہر تعلیم بھی - آپ معلم بھی ہیں اور فلاسفر بھی - یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کی شاعری میں ماورائے شاعری بھی کچھ چیزیں ملتی ہیں جو اپنی اہمیت میں کسی طرح کم نہیں - آپ کی شاعری میں بیان حُسن و عشق کے علاوہ زندگی پر تنقید و تبصرہ بھی ہے۔ آپ نے اگر محبت کے نکات بیان کئے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ زندگی کے مختلف رُخ کی پردہ کشائی بھی کی ہے - اگر وہ والہانہ انداز میں اپنے جذباتِ عشق کی ترجمانی کرتے ہیں تو کبھی کبھی حیات و کائنات پر نگاہ تنقید بھی ڈالتے ہیں - آپ کی شاعری تقلید سے یکسر پاک و صاف ہے - آپ ایک حقیقی شاعر ہیں اور اپنی شاعری کو آپ نے زیادہ تر جذبات و تاثرات تک محدود رکھا ہے حضرت فراقؔ نے اپنے سوانح حیات بہت مفصل دئے ہیں اور اپنی شاعری کے متعلق خود اپنی رائے کا اظہار کیا ہے - جس سے ہم اُن کے رجحانِ طبع اور اُن کے مذاقِ شاعری کا کچھ صحیح اندازہ کر سکتے ہیں - ایک جگہ آپ رقمطراز ہیں :-

"شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو زندگی کا آئینہ بنانا مقصودِ زندگی ہو - کون جانے ---" اس میں شک نہیں کہ آپ کی شاعری حیات پر ایک بسیط نقد و تبصرہ ہے اور آپ کے اشعار آپ کی زندگی کا عکس ہیں - آپ نے حیات و کائنات کا بہ نگاہِ غائر مطالعہ کیا ہے - آپ کے احساساتِ صحیح سے حیاتِ انسانی کا کوئی رُخ پوشیدہ نہیں ہے اور آپ کی تنقید حیات میں ایک خلوص و حقیقت ہے - جو دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی -

جناب فانیؔ کی طرح آپ کے لئے بھی زندگی معمہ سے کم نہیں - آپ جس زندگی کی تلاش میں ہیں وہ آپ کو اس دُنیا میں نظر نہیں آتی بلکہ ماورائے افہام و تفہیم ہستی کی حیثیت رکھتی ہے ---- چنانچہ آپ زندگی کی اُلجھنوں سے عاجز آکر کہتے ہیں کہ

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی — زندگی اُلجھی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

اور پھر آپ جب اس عملی زندگی کو اپنی تخیلی زندگی سے مختلف پاتے ہیں تو آپ کی شدتِ احساس آپ کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ

کیسی خوشی - کہاں کا الم یہ کوئی بتاؤ — دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

"عشق زندگی کی اعلےٰ تخلیقی استعداد ہے - عشق ایک زبردست محرک شعری ہے - وہ جذبات انسانی کا سرتاج ہے

اس کی وارداتیں عالمگیر ہیں۔ یہ محرکِ شعری دُنیا کے ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ رہا ہے۔ فارسی اور اُردو میں اس موضوع پر ہمارے شعراء نے ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کئے ہیں کہ اُن کی مثال دوسری زبانوں میں شاید ہی ملے۔ عشق و محبت اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود انسانیت ۔ یہ جذبہ انسانی جبلّت کے ساتھ وابستہ ہے اور زندگی کا قوی ترین محرک"۔

جناب فراق کی شاعری میں بھی محبت کے رموز و نکات۔ حُسن کی لطافتیں اور عشق کی پہنائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو!

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں
رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم
نگاہِ ناز میں صبحِ ازل کی کیفیت — ارے یہ کچھ فسانے سُنائے جاتے ہیں
بجی بجی سی وہ نظر۔ ملی ملی سی وہ نظر — یہ فاصلے نئے نئے۔ یہ قربتیں نئی نئی
نگاہِ کامیاب کا بھی اعتبار اُٹھ گیا — ملیں ترے جمال کو نزاکتیں نئی نئی

جناب فراق اپنی شاعری کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے اپنے مذاقِ شاعری کا ایک اور پہلو واضح کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"مجھے تو زخم ہی کو مرہم بنانا تھا۔ پھر کیا کرتا۔ اگر درد بھری آواز میں سکت نہیں تو وہ نغمہ کہاں چیخ ہو گئی ہیں شاعری میں لب و لہجہ کو سب سے ضروری چیز سمجھتا ہوں۔ اسی لہجہ میں شاعر کی شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعر تمام عالم کے دکھ درد کے احساس کو بغیر کم کئے ہوئے اگر اس میں نرمی اور خیر و برکت سمو سکے تو اُس میں قوتِ شفا آجاتی ہے۔ اور شاید یہی چیز شاعری کو عظمت دے سکتی ہے" ہم جناب فراق کی شاعری میں یہی چیز پاتے ہیں اور یہی خصوصیت اُن کو دورِ حاضر کے دیگر شعراء سے الگ کرتی ہے۔ آپ کی شاعری میں غم و درد کے عناصر پائے جاتے ہیں مگر آپ بجائے اپنے آلام و مصائب کا رونا رونے کے اُن کو نہایت نرم و سبک لہجہ میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مُسکرا دیا
پچھلے پہر شبِ فراق کون یہ مجھ سے کہہ گیا — تیرا جواب پھر کہاں تو جو یہ درد سہہ گیا
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

آپ کے بعض بعض اشعار میں میر کا سوز و گداز اور میر کا سا اندازِ بیان پایا جاتا ہے اور اُن کے درد کی کسک کائنات کی روح کو تڑپا دیتی ہے۔

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو اور کچھ راتوں کو — دل ہی ڈوبا جاتا ہے اب آگ لگے برساتوں کو

جناب فراق کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذوقِ جمال کو ذوقِ سماع سے علیحدہ نہیں کرتے۔ اُن کا یہی ذوقِ جمال اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے اور اُن کی حیات وارداتِ حسن و عشق کا ایک لطیف دفتر ہے جس کی شرح ممکن ہی نہیں۔ آپ کے یہاں تغزل کا نہایت اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے اور آپ کے اشعار آپ کے وجدانِ صحیح کا پرتو ہیں۔ آپ انھیں اشعار کے ذریعہ اپنی دل کی خلش کو دور کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی

(اس شعر کا لہجہ اور طنز لطیف قابلِ توجہ چیزیں ہیں)

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو　　اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

کچھ تو رنگِ جہاں بدل ہی دیا　　تیرے دیدار کی تمنا نے

اظہارِ تمنا کی توفیق نہیں سب کو　　دیکھی ہے کبھی لے دل اِن آنکھوں کی گویائی

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا　　یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

میں ہوں۔ دل ہے۔ تنہائی ہے　　تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن　　کیا کریں گر نہ انتظار کریں

جوشِ تجدیدِ شوق سچ کہنا　　دل کو پھر ہم امیدوار کریں

یہ سب اشعار جذبات کی پاکیزگی اور اندازِ بیان کے لحاظ سے نہایت بلند ہیں اور پھر تغزل کی مخصوص سہل و نرم زبان اور سادگی اشعار میں دونا لطف پیدا کر رہی ہے۔ اِن سب کے علاوہ اشعار کا لب و لہجہ اور کہیں کہیں طنز و تعجب اور استفہام کی کیفیاتِ لطیف ایک کیف پیدا کر دیتی ہیں۔ جناب فراق کی شاعری کی بلندی کا ایک اور راز اُن کے اشعار کی رمزیت میں پوشیدہ ہے۔

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی ست　　حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

جناب فراق کے بعض بعض اشعار ایسے معنی خیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ انسانی اُن کے اندر جذباتی کنایہ پنہاں دیکھتی ہے، جیسے:

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں　　محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے　　آج تو کوئی آیا ہوتا

ان اشعار میں رمزیت کے علاوہ اجتماعِ ضدین ایک عجیب لطف دے رہا ہے۔ ایسے اشعار اُردو شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات آپ معمولی الفاظ سے گہرے جذباتی معانی کی تخلیق کرتے ہیں اور اسی رمزیت و کنایہ کی بدولت آپ کے محدود مشاہدہ میں بے پایانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ "رمزیت کا کمال یہ ہے کہ سامع کے حافظہ میں بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور ہوتی رہیں" اور یہ خصوصیت جناب فراق کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ملاحظہ ہو:۔

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر　　بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

پھر دِل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی ہوئی　　کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

اُن کے اشعار میں اس رمزیت کی بدولت غیر معمولی قوت۔ وسعت اور بلندی پیدا ہو گئی۔ آپ کی نظر زندگی کے متعلق بہت وسیع ہے۔ اس لئے لازمی طور پر آپ کے رمز و کنایہ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔

"زندگی تغیر و تبدیلی کا نام ہے"۔ مگر جناب فراق کی علوئے تخئیل اور آپ کے مذاقِ زندگی کی بلندی اِس مضمون کو یوں کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ:

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش　　تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

آپ کے جذبات کی شدت آپ پر غالب نہیں آتی بلکہ آپ کی شاعری آپ کے اپنے وقوفِ جذبات کا پتہ دیتی ہے اور آپ کے اشعار نفسیاتی کیفیات کی تحلیل ہیں۔ مثلاً:

دل میں کچھ غم بھی ہے سرور بھی ہے　　کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے
آخر تپاکِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہے　　تجھ سے وہ اے فراق بہت دور ہو گئے

الغرض آپ کی شاعری بہت بلند۔ پرکیف اور پر اثر ہے اور ایک حیثیت شاندار مستقل رکھتی ہے۔ آپ کی شاعری میں خامیاں بھی ہیں مگر اتنی کم کہ خوبیوں کے مقابلہ میں وہ قابلِ توجہ نہیں ہیں اور نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔

۲۲۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

جناب کیفی صاحب پُرانے غزلگو شاعر ہیں اور اُس دورِ شاعری کی یادگار جو اب ہندوستان میں قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ آپ کی شاعری کی ابتدا، غزل سے ہوئی اور ابھی یہ رنگ پختہ نہیں ہونے پایا تھا کہ آزاد و حالی کی صحبتوں کے اثر سے نیچرل شاعری شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر انتخاب میں ہمیں تغزل کے عمدہ نمونے نظر نہیں آتے۔۔۔ بلکہ وہی تقلید و فرسودگی مضامین کا رنگ غالب ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو ادب میں جناب کیفی کی ہستی ایک قابلِ قدر ہستی ہے اور ترقی اُردو میں آپ کی مساعی یقیناً قابلِ اعتراف و ستایش ہیں۔ مگر آپ کی غزل گوئی اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

عمل و عزم ہیں محروم جسارت ورنہ　　غیر ممکن کا محل عالمِ امکاں میں نہیں
پیکرِ خاک ہے تو۔ چرخ پہ چھا مثلِ غبار　　تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے

ان دونوں اشعار میں انسان کو عمل کا درس دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس 'خودی' کی تعلیم دی ہے جو اقبال کے پیغام شاعری کا جزو خاص تھی۔ اشعار کی بندش اور مضمون آفرینی آپ کی مشاقی کا ثبوت ہیں۔ مگر آپ کے اشعار میں جذبات کا فقدان اور تخئیل کی فراوانی ہے۔ اشعار میں تصوفانہ جھلک بھی موجود ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ عشقِ مجازی کی کیفیتیں بھی نظر آتی ہیں لیکن اِن میں کوئی جوش و خروش اور اثر آفرینی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں فارسی تراکیب سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے:

وسعت آرائی دلتنگیٔ حسرت۔ عشق محشر آرا۔ فرطِ سوزِ اُلفت۔ سمندِ شوق۔ دارفتہ ہوائے طرب۔ برہم زنِ حجاب خود رفتگیٔ حُسن۔ ارتقائے وحشت۔ درگہ توحید مآب وغیرہ وغیرہ۔ جس کی وجہ سے آپ کے کلام میں کہیں کہیں ثقل پیدا ہو گیا ہے اور شگفتگی کا عنصر کم۔

آپ کا کلام خامیوں سے یکسر پاک و صاف نہیں ہے اور کہیں کہیں آپ نے متروکات کو ابتک اپنے یہاں جایز رکھا ہے

جیسے: سکھلانا - بتلانا وغیرہ -

جلوے سکھلاتے ہیں نظارے کا انداز مجھے　　پردے آتے ہیں نظر سب نظر انداز مجھے
تو ہی بتلا دے مجھے یارب کہاں سجدہ کروں　　ذرے ذرے کو تو جلوے طور ساماں کر چکے

یا جیسے اس شعر میں :-

راز اُن کے کھُلے جاتے ہیں ایک ایک سبھوں پر　　اور اس پہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بجائے "سب" کے لفظ "سبھوں" استعمال کیا ہے جو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے -

ہو وہ رند یا صوفی مست اُس کی دھن میں ہے　　جانے کتنے میخانے بھر دیئے ہیں کوثر میں

اس شعر کے پہلے مصرع میں "کی" حشو ہے - "رند و صوفی اس دُھن میں مست ہیں" صحیح بھی ہے اور فصیح بھی -

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کٹتا ہے　　کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

اس شعر کے مصرع اولےٰ میں "جی کٹتا ہے" کے بجائے اگر "جی کڑھتا ہے" کہتے تو زیادہ فصیح تھا - اور اسکے علاوہ مصرع ثانی میں لفظ "ہم" "یاد نہیں" سے اس قدر متصل ہے کہ "ہم یاد نہیں" پڑھا جاتا ہے جو بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے اور جب تک لفظ "ہم" "یاد نہیں" سے الگ کر کے نہ پڑھا جائے تو مفہوم پیدا نہیں ہوتا - اس خامی کو یوں دور کیا جا سکتا تھا کہ مصرع ثانی یوں نظم کرتے کہ :

"کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں کچھ یاد نہیں"

انقلاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا ہو کبھی　　در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ "ایسا" کہنے کے بعد لفظ "جو" کی تشنگی محسوس ہوتی ہے اور یہ انداز بیان کی ایک خامی ہے اس لئے اگر پہلا مصرع یوں کہتے تو درست ہوتا کہ :

"انقلاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا جو کبھی　　در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

جناب کیفی کے کلام میں اس قسم کی اور خامیاں پائی جاتی ہیں - آپ کے کلام میں تغزل کی حقیقی چاشنی اور حلاوت نہیں ہے بلکہ تقلیدی شاعری کی مثالیں آپ کے کلام میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں - لیکن باوجود ان تمام باتوں کے آپ کے اشعار سے آپ کی مشاقی اور شاعرانہ اہلیت کا ثبوت ملتا ہے -

۲۳ - تلوک چند محرومؔ جناب تلوک چند محرومؔ، ایک پُرانے نظم گو شاعر ہیں - آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں - ہر چند کہ غزل آپ کا موضوع نہیں ہے - آپ کی غزلوں میں کہیں نظموں کا انداز پایا جاتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے جدت مضامین اور جدت بیان بھی ہے - مگر ساتھ ہی ساتھ پرانا رنگ شاعری بھی شامل ہے - رعایت لفظی کی مثالیں بکثرت آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں - آپ کے کلام میں زبان کے لحاظ سے خامیاں موجود ہیں - جیسے

پہلو میں دل ہے - درد کی دنیا کہیں جسے　　پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے

یہ لفظ "اُجاڑ" غزل کے لئے نہایت ثقیل ہے اور مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے -

مگر آپ کے زیر نظر انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا جذبۂ شاعری یقیناً فطری ہے اور زبان کی خامیاں ماحول کا

نتیجہ ہیں - آپ کی غزلوں میں صداقت معنوی اور جذبات کی بلندی پائی جاتی ہے - بعض بعض اشعار اپنی سادگی و طرفگیِ ادا کے لحاظ سے نہایت پُرکیف اور پُراثر ہیں - جیسے:

شبِ فرقت کی داستاں ہے طویل — نہیں المختصر نہیں آتی

شعر کے مصرعۂ ثانی میں "المختصر" کہکر شبِ فراق کی پوری داستان کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے اور بیان کی سادگی بھی شعر میں ایک کیفیت پیدا کر رہی ہے - آپ کا ایک اور شعر ہے،

تمھارے آستاں پہ خاک میری — زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے

ایک عام اور معمولی سی بات ہے مگر اندازِ بیان نے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے - آپ کے اشعار میں تغزل کا صحیح رنگ اور شوخی بھی پائی جاتی ہے - ملاحظہ ہو:

تمھیں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیِ رفتار — چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بجھا کے چلے
رہے گی حاجت شرح جفا نہ محشر میں — اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے
وہ رعب حسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات — یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے
ہے یہ دُنیا ایک ہی افسانۂ ناکام شوق — جس نے جو چاہا الگ تجویزِ عنواں کر دیا
جو تو غمخوار ہو جائے تو غم کیا — زمانہ کیا - زمانے کے ستم کیا

کہیں کہیں آپ نے اپنے اشعار میں اپنے مشاہدۂ کائنات اور تجربات کو بھی سمویا ہے اور کوشش کی ہے کہ تغزل کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے - جیسے:

ہو دورِ غم کہ عہدِ خوشی - دونوں ایک ہیں — دونوں گزشتنی ہیں خزاں کیا بہار کیا
عقل کو کیوں بتائیے عشق کا راز — غیر کو رازداں نہیں کرتے
اب جہاں میں اُن کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں — عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے
سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم — مجھے یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

مگر پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ آپ کا رجحانِ طبع نظم کی طرف ہے اور اُن کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں ان کی نظموں کا رنگ جھلکتا ہے - مثلاً:

شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی — کہ ایمائے خموشی ہے کواکب کے اشاروں میں
نسیمِ صبح کا جھونکا نفس تیرا — رہے گی سوختہ حالوں کو آرزو تیری
اے جانِ بہار تیرے دم سے — گلزار ہوا تمام رنگیں،
پھر جوشِ بہارِ گل ہے بلبل — ہر سمت بچھے ہیں دامِ رنگیں

۲۴ - انند نرائن ملاؔ

جناب انند نرائن ملا دورِ حاضر کے ایک خوش فکر نظم گو شاعر ہیں مگر آپ غزلیں بھی کہتے ہیں - آپ کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور اب ہر دو اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں - آپ کی غزلیات میں غزل کی شیرینی اور لوچ موجود ہے - اور دوسرے نظم گو شعرا کی طرح آپ کی غزلوں میں

نظم کا انداز نہیں پایا جاتا بلکہ برعکس آپ کی نظموں میں بھی غزلوں کا سریلا پن موجود ہے۔ آپ کے خودنوشت سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قافیہ و ردیف کی پابندی کو سامنے رکھ کر فکرِ سخن نہیں کرتے۔ بلکہ دو دو چار شعر طبعزاد زمینوں میں خود نکل آتے ہیں۔ نیز آپ نے کسی اُستاد سے مشورۂ سخن نہیں کیا کہ کہیں اُس کا رنگِ شاعری آپ کے کلام پر حاوی نہ ہو جائے۔ اور اس طرح ایک حد تک اپنی انفرادیت کو قایم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے جناب ملا تقلید سے نہ بچ سکے۔ ملاحظہ ہو:

شیخ! میں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنت کے لئے — جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنت نہ تھی
مائل بہ ستم چرخ۔ زمیں برسرِ کیں ہے — آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے
سوکھنے پائے نہ دل میں دیکھ خوئے آرزو — سیکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

مگر آپ کی شاعری کی بنیاد بھی جذبات پر ہے حالانکہ کہیں کہیں تخئیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور اُس میں زبان کی صفائی۔ الفاظ کی بندش اور مضمون آفرینی ایک لطف پیدا کر دیتی ہیں۔ جیسے:

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی — قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی
یہ دل کیا ہے۔ کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا — تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی
آلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب — خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر
دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد — اشک موتی ہیں مگر غم کی جلا ہونے کے بعد
وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی ملگئی فرصت — ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

اِن سب اشعار میں زیادہ تر تخئیل سے کام لیا گیا ہے۔ خوشنما نشست الفاظ اور معنی آفرینی نے اشعار کو قابل توجہ بنا دیا ہے ورنہ اِن میں کوئی سوز و گداز۔ اثر آفرینی یا کیفیت و جدانی نہیں ہے۔ لیکن آپ کے کلام میں تغزل کے صحیح نمونے بھی ملتے ہیں۔ جو بلحاظ اپنی پاکیزگیِ جذبات۔ جدتِ ادا۔ سادگی اور اثر کے نہایت پُر لطف اور پُر کیف ہیں۔ مثلاً:-

ہشیار حسن۔ حیرت ارمان بن چلی ہے — پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے
اتنا بھی مرے عہدِ وفا پہ نہ کر شک — ہاں! ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسم جہاں اور

(اس شعر کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ شعر میں ایک عجیب لطف پیدا کر رہا ہے ——)

ابھی سن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو — کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم تمھیں بھلا سکے — کوئی کمی ہمیں میں تھی۔ یاد تمھیں نہ آسکے
قفل سا اک زباں پہ تھا۔ آنکھ میں کچھ نمی سی تھی — ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے
تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر — دل کے آئینہ میں بال آ ہی گیا
تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل۔ جان کے بن نہ بیخبر — معنیٔ خامشی سمجھ۔ صورتِ خامشی نہ دیکھ
پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے — ہر گام پہ فریبِ منزل کا سامنا ہے

دِل بجھا ۔ شمع کا ثبات گئی زندگی کی اُجالی رات گئی

اِن سب اشعار میں کچھ ہو یا نہ ہو مگر ایک اثر و کیفیت ضرور پائی جاتی ہے اور یہ سب اشعار جناب ملّا کے رنگِ تغزل کے آئینہ دار ہیں ۔ مگر ہمیں جہاں اِن کے کلام میں پُر لطف اشعار ملتے ہیں وہاں اُن کے کلام میں کہیں کہیں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔ جیسے :

دل کا چراغ جب تلک تجھسے جلے جلائے جا رات بھی ہے اگر تو کیا۔ رات کو دن بنائے جا

"تلک" دورِ حاضر میں متروک ہو چکا ہے اور اس کا استعمال غیر فصیح خیال کیا جاتا ہے ۔

۲۵- ناطق گلاوٹھی

جناب ناطق پُرانے غزل گو شاعر ہیں اور آپ کو حضرت داغ سے شرف تلمذ حاصل رہ چکا ہے ۔ آپ کے کلام میں قدیم رنگِ سخن غالب ہے اور آپ کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے داغی اسکول کا تتبع کیا ہے ۔ جیسے :

ناز اُدھر دل کو اُڑا لینے کی گھاتوں میں رہا میں اِدھر چشمِ سخن گو تری باتوں میں رہا
فراہم کر رہا ہوں اپنی بربادی کا افسانہ جو گلیاں میں نے دیکھی تھیں وہ گلیاں دیکھتا ہو نمیں
کہتے ہیں جسے وحشت وہ بات کہاں صاحب کیا کہتے ہو مجنوں ہے دیکھا ہوا دیوانہ
لاتا صنم کدے سے کیا تھی محال واعظ جی ہاں ! ہمیں اُٹھاتا ہم راہ میں پڑے تھے
حلال کر گئے کہکر کہ اب نہ آئیں گے وہ جاتے جاتے تڑپتے پہ ہاتھ ڈال گئے

ان اشعار میں نہ کوئی علوئے تخیل ہے نہ پاکیزگیٔ جذبات ۔ نہ جدت بیان ہے نہ ندرتِ ادا ۔ بلکہ چند فرسودہ اور پامال مضامین کو نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے اور مندرجۂ بالا اشعار کے الفاظ "گھاتیں ۔ صاحب ۔ جی ہاں ! گلیاں ۔ حلال وغیرہ وغیرہ سب اس بات کے غماز ہیں کہ جناب ناطق صاحب نے حضرت داغ کے کلام و زبان کی تقلید کی ہے جس میں اپنے جذبات و تاثرات کو کوئی دخل نہیں ۔ اس قسم کے اشعار آپ کے یہاں اور بھی ملتے ہیں ۔ کہیں کہیں رعایت لفظی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور بعض بعض اشعار میں ہم کو ناسخ کا رنگ شاعری بھی نظر آتا ہے ۔ مثلاً :

ہم کو شیرینیٔ راحت کی تمنا یعنی کم ہے کچھ تلخیٔ ذوقِ دہن و کام ابھی
کھا رہا ہوں رنج اگلی صحبتوں کی یاد میں ہے پُرانے دوستوں میں آج مہمانی مری

ان اشعار میں الفاظ کی رعایت کی وجہ سے آورد پیدا ہو گئی ہے اور کسی قسم کی کوئی کیفیت و دلکشی نہیں ۔

آپ کے کلام میں صفائی و سادگی ضرور ہے مگر اثر آفرینی نہیں ۔ آپ کے اشعار میں سوز و گداز اور کیف و شگفتگی کی کمی ہے ۔ آپ کی اپنی کوئی آواز نہیں بلکہ تقلیدی شاعری کی آواز بازگشت ہے ۔ زبان کے لحاظ سے آپ کا کلام یقیناً بہت صاف ہے اور اندازِ بیان میں وہی سادگی اور لہجہ میں وہی دھیما پن اور لوچ موجود ہے جو ادائے تغزل کے لئے مخصوص ہے ۔ آپ کے یہاں بیجا شکوہ الفاظ اور غیر مانوس تراکیبِ فارسی نظر نہیں آتیں ۔ یہی سبب ہے کہ جب آپ کبھی تقلید سے ہٹ کر اپنے تاثرات و وجدان کو نظم کر جاتے ہیں تو وہ کچھ دیر کے لئے اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور اُنکے بھی اشعار اپنے اندر ایک کیفیت رکھتے ہیں اور دلوں کو مسحور کر لیتے ہیں سادگیٔ بیان ۔ لہجہ کا انداز اور طرزِ ادا کی معصومیت

دبے ساختہ پن ملاحظہ ہو:

کہنے والا وہ ۔ سننے والا میں — ایک بھی آج دوسرا نہ ہوا
اب کہاں گفتگو محبت کی — ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا
یاد کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق — پہلے وہ بھول تو جاؤں جو مجھے یاد نہیں
اے نگاہِ مست اس کا نام ہے کیفِ سرور — آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے
صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں — میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں
کیا کروں بیکار کوشش مسکرانے کے لئے — کس کی لے آؤں ہنسی ہونٹوں تک آنے کے لئے
گئے ہیں جب سے وہ اپنے بھی آئے غیر بھی آئے — سب آئے بھی گئے بھی گھر کی ویرانی نہیں جاتی
مرے غم کی اُنھیں کس نے خبر کی — گئی کیوں گھر سے باہر بات گھر کی

اِن اشعار میں صحیح رنگِ تغزل اور رنگِ تغزل کا مخصوص لب و لہجہ۔ سادگی اور روانی سب ہی کچھ پایا جاتا ہے اور اسلوبِ بیان نے اُن میں ایک تازگی اور کیف پیدا کر دیا ہے۔ ہر چند آپ کے اشعار سے شانِ مشاقی نمایاں ہے مگر پھر بھی آپ کا کلام خامیوں سے یکسر پاک نہیں۔

زبان کے لحاظ سے جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں آپ کا کلام بہت صاف ہے مگر ہمیں اس مختصر سے انتخاب میں ایک جگہ زبان کی بھی خامی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں — یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی

"کوئی ہمیں پہچانا نہیں"، نہ صرف روزمرہ کے خلاف بلکہ نہایت غیر فصیح ہے اور ہم عام بول چال میں کبھی ایسے نہیں بولتے کہ "ہمیں کوئی نہیں پہچانا"۔ بلکہ "ہمیں کسی نے نہیں پہچانا" بولتے ہیں۔

بہر حال جناب ناطق کے کلام میں جدت، شگفتگی اور سوز و اثر کم اور مشاقی زیادہ نمایاں ہے۔ آپ کے کلام میں جوش و ولولہ کا بھی فقدان ہے۔ نیز آپ کے بہت کم اشعار ایسے ہیں جو دل پر کوئی نقش چھوڑ جائیں۔

۲۶۔ ناطق لکھنوی

جناب ناطق لکھنوی بہت پرانے کہنے والے ہیں مگر آپ کے کلام میں صحیح تغزل کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ بعض اشعار تو آپ نے اپنے انتخاب میں ایسے دئے ہیں جو کسی طرح بھی تغزل کی حدود میں نہیں آتے۔ جیسے:

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا — موصوف کل صفات ہے ہر جز صفات کا
نار کو نور کر دیا سرورِ کائنات نے — وہ جو لگی تھی طور پہ آ کے بجھی حجاز میں
بزرگانِ سلف جب تک رہے رونق رہی ناطق — جب آخر ہو گئی محفل تو ہم پہونچے ہیں محفل میں
اک سنہری سطر تھی جس کی شعاع برقِ طور — آج وہ خط صاحبِ معراج کے نام آ گیا
مزاج دانوں میں روح القدس بھی ہیں ہم بھی — یہ دیکھنا ہے کہ کون انتخاب ہوتا ہے

یہ اشعار جو کچھ بھی ہوں مگر غزل کے شعر نہیں معلوم ہوتے۔

جناب ناطق لکھنوی دیرینہ رنگِ شاعری کے مقلد ہیں۔ آپ کے یہاں تصوف و فلسفہ بھی ہے اور عشقِ مجازی بھی آپ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ الفاظ کی تکرار کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اس طرح ایک ہی لفظ کو ایک ہی شعر میں دو تین بار استعمال کر کے زورِ بیان پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
میں سراپا دل ہوں۔ دل میرا پا درد ہے

روح کا عقدہ اُلجھکر عقدۂ مشکل بنا
پھر وہ عقدہ پیکرِ انسانیت میں دل بنا

عشق کی خاطر سے انساں عشق کے قابل بنا
درد پہلے بن چکا تھا۔ بعد اُس کے دل بنا

سو تیر زمانے کے۔ اک تیر نظر تیرا
اب کیا کوئی سمجھے گا دل کس کا نشانہ ہے

یہ دِل نہیں۔ نور کا ہے شعلہ۔ کسی سے اسکو ضرر نہیں ہے
مثالِ برق و شرر ہے۔ لیکن مزاج برق و شرر نہیں ہے

ہمیں اس قسم کی مثالیں جناب ناطق کے دیوان کا تو کیا ذکر۔ اس مختصر سے انتخاب ہی میں بہت ملتی ہیں۔

آپ کا کلام زیادہ تر تقلیدی شاعری کا نمونہ ہے اور آپ کے اشعار میں کم و بیش تصوف کی جھلک پائی جاتی ہے مگر جہاں آپ نے اس رنگ سے ہٹ کر اپنے جذبات کو نظم کیا ہے، وہ پُر اثر بھی ہے اور پُر کیف بھی۔ جیسے:

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمھاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

گزاری دیکھنے میں اُس کے ساری زندگی میں نے
مگر یہ شوق ہے دیکھا نہیں گویا کبھی میں نے

محبت ایک مدت سے ہے یہ معلوم ہوتا ہے
تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

محبت انسان کی ہے فطرت۔ کہاں ہو امکانِ ترکِ اُلفت
وہ اور بھی یاد آرہا ہے میں اُس کو جتنا بھلا رہا ہوں

ڈوبتا ہوں میں مدد میری کرے جو کوئی ہو
مجھ کو احساسِ خدا و ناخدا باقی نہیں

آنکھوں کو بچائے تھے ہم اشک شکایت سے
ساقی کے تبسم نے چھلکا دیا پیمانہ

مگر اس رنگ کے اشعار آپ کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ بعض بعض جگہ آپ کے یہاں سوز و گداز کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور کہیں کہیں آپ کے اشعار میں سادگیِ بیان اور طرزِ ادا شعر کو نہایت پُر اثر بنا دیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سر آنکھوں پر غمِ دنیا و عقبیٰ
مگر اب دل میں گنجایش کہاں ہے

(دوسرے مصرع کی بیساختگی اور ادائے بیان نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے)

صیاد سے بھی اُنس۔ رہائی کا شوق بھی
اک دل مرا قفس میں ہے اک آشیانے میں

احساسات کے امتزاج کی کس قدر عمدہ مصوری کی ہے کہ سامع دوسروں کے صحیح جذبات و تاثرات سے وقوف حاصل کر لیتا ہے اور پھر پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ جناب ناطق ایک مشاق سخن گو ہیں اور ہر چند کہ آپ کا کلام پختگی کی حد تک پہونچ چکا ہے مگر پھر بھی ہمیں آپ کے یہاں زبان و بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً:

خیالِ دوستی میں محو تھا۔ مجھ کو معافی دے
نہ پہچانا جو تجھ کو اے نگاہِ دشمنی میں نے

"معافی دے" کا ٹکڑا نہ فصیح ہے اور نہ اہلِ علم کی بول چال میں مستعمل۔ علاوہ بریں اِس فقرہ میں جو لہجہ پوشیدہ ہے وہ بھی مذاقِ سلیم پر ناگوار گزرتا ہے۔

وقتِ بے ہوشی جب آجائے جبھی آلام ہے، دِل مسافر کا جہاں ڈوبے وہیں پر شام ہے

اس شعر کے مصرعۂ اولےٰ میں "آلام" کے صرف کی کوئی وجہ ہی نظر نہیں آتی۔ "بے ہوشی" میں انسان کی غمِ دُنیا سے بے خبری وجہ سکون ہے نہ کہ وجہ الم۔ اگر "آلام" کی جگہ "آرام" نظم کرتے تو صحیح ہوتا۔[1]

دیکھ کر اُن کو نظر میں یہ اثر ہوتا ہے جس طرف دیکھئے اِک حُسن نظر آتا ہے

"ہوتا" اور "آتا" قوافی نہیں ہیں اور اس صورت میں جبکہ یہ مطلع نہیں ہو سکتا تو دونوں مصرعوں میں "ردیف "ہے" کا استعمال غلط ہے۔ اس طرح اس شعر میں "تقابلِ ردیفین کا ایک بہت بڑا عیب موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے مصرعہ میں "ہوتا ہے" غلط شایع ہو گیا ہے (حالانکہ اس کے شایع ہونے کے بعد مارچ اپریل یا مئی کے نگار میں اس کی کوئی تصحیح نہیں کی گئی جس طرح جناب سیماب اکبر آبادی کے بعض اشعار کی جو غلط شایع ہو گئے تھے، تصحیح کی گئی تھی۔) اور اُس کے بجائے "آتا ہے" نظم کیا گیا ہے اور "اثر" "نظر" قوافی ہیں تو پھر یہ "اثر آتا ہے" کا ٹکڑا نہایت غیر فصیح ہے۔ "اثر پیدا ہونا" یا "اثر ہونا" تو مستعمل ہے مگر "اثر آنا" نہیں بولتے اور اس کا صرف روزمرہ اور محاورے کے خلاف ہے۔

کہیں کہیں آپ کے یہاں مخصوص پُرانا لکھنوی رنگ اور بعض جگہ رعایتِ لفظی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے:

جوشِ گریہ اور اندھیری رات ہے کیا گھٹا ہے۔ کیا بھری برسات ہے

نگاہِ سوزِ محبت میں اب گناہ کہاں نکل رہا ہے یہ آنکھوں سے شعلۂ بے دود

جناب ناطق لکھنوی کہنہ مشق شاعر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اپنی کہنہ مشقی کی بدولت کچھ اچھے شعر ضرور نکال لئے ہیں مگر ایک شخص اُن کا کل انتخاب کلام دیکھنے کے بعد اُن کی شاعری سے متاثر نہیں ہو سکتا اور ان کے اچھے اشعار بھی دل پر کوئی دیرپا اثر چھوڑ جانے والے نہیں ہیں۔

(باقی) سید علی سجاد قہر اکبر آبادی۔ بی۔ اے

[1] آلام غلط چھپا ہے۔ آرام ہونا چاہیئے۔

گلشنِ صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

"شباب"

ادب اُردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہلِ قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے۔ ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین۔ دلچسپ معیاری افسانے۔ اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے۔ تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پُرکیف غزلیں۔ وجد آور سرمدی نظمیں۔ دلآویز پیارے پیارے گیت۔ ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں، دلفریبیوں اور معنوی خوبیوں کے مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا فوراً اپنے اسمِ گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔

منیجر "شباب" پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۶ - بمبئی ۳

چینی باپ کے باغی بیٹے

ہم لوگ پُرانے طرز کے ایک ہوٹل "شان ٹنگ" میں، دستور کے مطابق باورچی خانے سے ہوتے ہوئے داخل ہوئے وہاں باورچی خانے ہمیشہ سامنے کی طرف ہوتے ہیں، اس لئے مہمان گزرتے وقت کھانوں کو مٹی کے چولھوں پر پکتا ہوا دیکھ سکتے ہیں - یہ رسم اس وجہ سے ہے کہ وہاں پکانا ایک مستقل فن ہے - ہم سب ایک بڑے کھانے کے کمرے سے گزر ہی رہے تھے کہ ایک کرخت آواز نے ہمارا استقبال کیا - اس آواز کو ہم چیخ، پکار یا شور کا نام نہیں دے سکتے - یہ ایک بھاری آواز والے خادم کے کھلے ہوئے حلق سے نکلا ہوا استقبالیہ نعرہ تھا ـــــ "تین مہمان تشریف لائے ہیں" - منچوریا کے ہوٹلوں کا، جہاں بکثرت لوگ آیا کرتے ہیں، یہ بھی ایک دستور ہے -

جوں ہی ہم سب اوپر پہونچے ایک دوسرے خادم نے بھی اُسی استقبالیہ نعرے کا اعادہ کیا - اب ہم کھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوئے، یہاں کھانے کے کمرے لکڑی کے تختوں کو کھڑا کر کے بناتے ہیں - یہ تختے زیادہ بلند نہ تھے بلکہ فرش اور چھت کے درمیانی حصہ تک آکر ختم ہو جاتے تھے - ابھی خادم نے ہاتھ پوچھنے کے لئے ہم لوگوں کو نرم تولئے دئے ہی تھے کہ استقبالیہ نعروں نے کچھ اور مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا - ان مہمانوں نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے سارے ہوٹل کو سر پر اُٹھا لیا - منچوریا کے کسان جب ایک دوسرے کا استقبال کرتے ہیں تو اپنے خیال میں یگانگت کی کوئی رسم اُٹھا نہیں رکھتے 'مہذب' چینیوں کی طرح وہ صرف مصافحہ کرنے یا سر خم کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے - وہ چونکہ فطرتاً خاموش نہیں ہوتے ہیں اسلئے صرف شانوں کو جنبش دے لینا اُن کے خیال میں کافی نہیں ہوتا - وہ چلاتے ہیں اور اتنا چلاتے ہیں کہ کم سننے والوں کے بھی کان کے پردے ہل جائیں - وہ چلا کر کہیں گے -

"اُوہو! شن یوئینگ ہیں" یا

"اہا ہا! شن یوئینگ، تم پھر اپنی جیب بھر کر شہر آگئے"

وہ آپس میں باتیں کرتے وقت لفظ "چنگ" (مہربانی) کا استعمال قطعاً غیر ضروری سمجھتے ہیں - وہ ہمیشہ سیدھی سادھی دوٹوک باتیں کرتے ہیں اور گیہوں وغیرہ کے بورے فروخت کر چکنے کے بعد تو وہ اور زیادہ صاف دل اور صاف گو ہو جاتے ہیں اور اسوقت وہ ہوٹلوں میں جا کر کھانے، شراب اور چاء وغیرہ پر بڑی بڑی رقمیں صرف کر دیتے ہیں - یہیں بیٹھ کر وہ ایک دوسرے کا درد دکھ سنتے ہیں اور یہیں وہ اپنی کمائی پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں -

استقبالیہ نعرے کے ساتھ مہمانوں کی ایک نئی جماعت داخل ہوئی - جس وقت وہ گزر رہے تھے، ہم نے اپنے کمرے کے نیم وا پردوں سے دیکھا کہ وہ فلٹ کے جوتے، چست پائجامے اور روئی کے کوٹ پہنے تھے - وہ گنتی میں چھ تھے -

ہمارے بغل والے کمرے میں داخل ہوئے اور بیٹھتے ہی بلند آواز سے باتیں شروع کر دیں۔ پہلے فصلوں کے متعلق تبادلۂ خیال ہوتا رہا، پھر سڑکوں کی خرابی اور بیل گاڑی سے سامان لے جانے کی دشواریوں کا ذکر کیا گیا اور آخر میں بازار کے بھاؤ پر بحث ہوتی رہی۔

"بھائی تکلف نہ کرنا" ایک کرخت آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم سمجھ گئے کہ کھانوں سے لبریز پیتل کا بڑا طشت میز پر رکھا جا رہا ہے اور وہ لوگ اپنی تیلیاں سنبھالنے ہی والے ہیں۔ "کھانا اچھا ہے" ایک آواز نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا:۔

"اگر ہم سو برس بھی زندہ رہیں تو ایسا کھانا ہمیں گاؤں میں نصیب نہیں ہو سکتا"۔ "ہم دیہاتیوں کو شہر میں بہت ہوشیاری کے ساتھ رہنا چاہئے" ایک نے کہا "شہر کے لوگ بڑے دھوکہ باز اور فریبی ہوتے ہیں"۔ "ایسے موقعہ پر تو پولیس سے مدد لینا چاہئے"

"نہیں — پولیس والے تو اور بھی فریبی و دغاباز ہوتے ہیں" کسی نے جواب دیا۔

اب ایک کسان نے اپنا نجی معاملہ شروع کیا:۔ "میرا لڑکا اکیس برس کا ہو گیا ہے۔ میں اُسکی شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ اس کے لئے طیار نہیں ہوتا۔ ذرا دیکھو تو۔ تین برس ہوئے میں نے اُس کو ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ اب اسکے خیالات بدل گئے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں وہ اور پڑھنا چاہتا ہے۔ میں نے اُس سے صاف صاف کہدیا اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ شہروں کے طرحدار اسکولوں میں کھیل کود، ناچ رنگ اور تصویریں بنانا سکھلایا جاتا ہے یا پھر اُچک پھاند بتلاتے ہیں، جسکو وہ ورزش کہتے ہیں۔ میں نے تو صاف صاف کہدیا کہ کسان کو نہ تو تصویریں بنانے کی ضرورت ہے اور نہ ناچ گانے کی۔ اُسنے مجھ کو جواب دیا کہ:۔ "تندرست جسم کے اندر حسین روح کی ضرورت ہے"۔ آپ نے دیکھا، اسکول میں اسی قسم کی باتیں سکھلائی جاتی ہیں!" اس پر سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

"میں نے اُس سے بھی کہدیا اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ میں نے کافی دولت پیدا کی ہے جو میری زندگی کے لئے بہت ہے جب میرے پاس یہ سب موجود ہے تو اس کو کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ تو کہتا ہے کہ شادی کرنے سے مرجانا بہتر ہے۔ تم بھلا اس موقعہ پر کیا کرتے؟" — "میں ہوتا تو ایک تھپڑ رسید کرتا"۔ ایک کسان نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں نے بھی یہی کیا" باپ نے فخر کے انداز میں جواب دیا "اور ایک ہی نہیں بلکہ کئی تھپڑ مارے اور ایک مرتبہ تو اتنی مرمت کی کہ ایک ہفتہ تک وہ چل پھر بھی نہ سکا"

میز کے گرد بیٹھنے والوں نے پھر قہقہہ بلند کیا۔ یہ بڑے اطمینان کا قہقہہ تھا۔

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا" ایک کسان نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن" باپ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا "اس مار پیٹ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ وہ تو کہتا ہے کہ میں اُس لڑکی سے واقف ہی نہیں ہوں اور کسی ایسی لڑکی سے میں ہرگز شادی نہ کروں گا جس کی میں نے صورت بھی نہ دیکھی ہو۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس جواب پر دو چار ہاتھ رسید کرتا مگر میں نے ضبط کیا۔ اُس کو سمجھانے کے لئے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلایا۔ اُن سب نے سمجھایا کہ شادی کر لو۔ باپ کے حکم سے سرتابی کرنا بُرا ہوتا ہے۔ لڑکی کے گھر والے ناراض ہیں کیونکہ اس میں لڑکی کی بڑی رسوائی ہے اور تمھاری اس حرکت سے تمھارے باپ کے نام کو بھی بٹہ لگے گا۔ لیکن سب بے سود اُس پر کسی بات کا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اُلٹا کہنے لگا "اور میرا کیا حشر ہوگا۔ میرا باپ میری زندگی برباد کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ ایسا سپوت ہے میرا بیٹا وہ اپنے سے تگنی عمر والوں کی صلاح کا بھی احترام نہیں کرتا۔

"میں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ اگر اُس نے شادی نہ کی تو میرے ہاتھوں اُسکو دانہ پانی نصیب نہ ہوگا۔ اس کا اُسنے جواب دیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ فاقے کرکے مرجائے گا اور میں بے اولاد ہو جاؤں گا۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ کھانے کا ذکر کرکے میں نے غلطی کی۔ مجھ کو اس کا ذکر کرنا نہ چاہئے تھا۔ اب اُس کو ایک نئی چال ہاتھ آگئی ہے۔ ایک ہفتہ تک تو وہ آوارہ گردی کرتا رہا پھر ایک دن آکر کہنے لگا کہ مجھ کو پڑھنے کے لئے روپیہ دو ورنہ میں فاقے کرکے جان دیدوں گا۔ اور یہ فاقے سال کے نئے دن سے شروع کروں گا۔ سال کا نیا دن جلد ہی آنے والا ہے۔ اُس دن ہم لوگ دعوتیں کرتے ہیں اور میرا لڑکا اُسی دن سے فاقے شروع کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ تم اس جگہ پر کیا کرتے؟"

کچھ دیر سناٹا رہا گویا وہ سب لڑکے کے فیصلہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ جہاں تک مسئلہ کی نوعیت کا تعلق تھا، اب اس نوع کے مسائل اُن کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھے لیکن یہ چال انوکھی ضرور تھی۔ اُن کے گرد و پیش جتنے لڑکے تھے وہ سب یا تو بغاوت کر رہے تھے یا بغاوت کرنے کی طیاری میں مشغول تھے۔ اور وہ اپنی مقصد براری کے لئے تمام ناجائز ترکیبوں کا استعمال جایز سمجھتے تھے

بالآخر ایک کسان کی کرخت آواز نے سکوت توڑا "میرے پڑوسی کے بھی ایک ایسا ہی لڑکا ہے مگر اُس نے تو صاف صاف کہدیا کہ اگر لڑکے نے شادی نہ کی تو یا تو وہ اپنی جان دیدے گا یا لڑکے کو مار ڈالے گا۔ لیکن اس جواب کو سُنکر لڑکا گھر سے بھاگ گیا اور اب اس کا خط آیا ہے کہ وہ کبھی گھر واپس نہ آئے گا۔"

"میرے پڑوسی نے" اب ایک دوسرے کسان نے شروع کیا "اپنے لڑکے کو اس قدر مارا کہ وہ شادی کے لئے طیار ہوگیا (ایک کسان چونکا ہوا کہ کہیں 'پڑوسی' کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں ہے)۔ لیکن شادی کے لئے جب سب لوگ جمع ہوئے اور شادی کے تحائف لڑکے کے والدین کو پیش کئے جا چکے تو لڑکا یکایک مجمع کے اندر غائب ہوگیا۔ اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر چکے ہیں مگر اب تک اُس کا کوئی پتہ نہیں۔"

"ذلتیں دنیا میں کئی طرح کی ہوتی ہیں" ایک دوسرے کسان نے اب اپنا دکھڑا شروع کیا "میرے لڑکے نے ہمیشہ بے چون وچرا میرے حکم کی تعمیل کی، چنانچہ وہ شادی کے لئے بھی میرے حکم سے طیار ہوگیا۔ لیکن جب اُس نے اپنی بیوی شکل پہلی بار دیکھی تو اُس نے تمام اعزہ اور مہمانوں کی موجودگی میں رونا دھونا شروع کیا کہ اُس کی بیوی بدصورت ہے۔ وہ تو بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اُس کو خاموش کیا گیا۔ اگر یہ اُس کی شادی کا دن نہ ہوتا تو شاید میں اس حرکت پر اُس کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا۔"

یہاں پر دو کسانوں نے اس انداز سے حلق صاف کیا، گویا وہ مصیبت زدہ باپ کی موجودگی میں ہنسنا مناسب نہیں سمجھتے لیکن وہ کسان جو اپنے لڑکے کی بھوک ہڑتال کے نتائج پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہا تھا اُسنے یہ محسوس نہیں کیا۔ اُس نے پھر شروع کیا۔

"میں نے ہمیشہ دیوتاؤں کی عزت کی ہے اور یہی دعا مانگی ہے کہ وہ مجھکو اولاد صالح عطا کریں لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ مجھے ایسا لڑکا ملا۔ شاید میں نے پچھلی زندگی میں کوئی سخت گناہ کیا تھا اور آنے والی زندگی میں شاید میں کتے یا بکری کی شکل میں جنم لونگا۔ کاش میں اپنے لڑکے کی شادی اور پھر اسکی اولاد کو اپنے پیروں کے پاس کھیلتا ہوا دیکھتا۔ مگر میرا لڑکا تو خچر کی طرح ضدی ہے۔ اگر ماروں تو وہ بھاگ جائے گا، نہ ماروں تو شادی کے لئے طیار نہ ہوگا، پڑھنے کے لئے روپیہ نہ دوں تو وہ فاقے کرکے جان دیدے گا اور اگر روپیہ دیدوں تو شادی نہ کرے گا۔ میری جان سنیق میں ہے"

"آجکل سب لڑکے ایسے ہی نافرمان ہوتے ہیں" ایک بھدی آواز نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی "ہمارے زمانے سے یہ زمانہ بالکل مختلف ہے۔ ہم اپنے والدین کی اطاعت فرمانبردار اولاد کی طرح کیا کرتے تھے مگر آج ہماری اولاد اپنے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اسکولوں میں جانے کے بعد اُن کے سروں میں بُرے بُرے خیالات سما جاتے ہیں۔ میرے تین لڑکوں میں سے ایک نے تو اس پر اعتراض کر ڈالا کہ میں اپنے کاشتکاروں سے آدھی پیداوار کیوں لے لیتا ہوں۔ میرے تین اسامی ہیں اور تینوں اُتنا ہی لگان ادا کرتے ہیں جتنا اُن کو دینا چاہئے، لیکن میرا لڑکا جو خود اس آمدنی میں حصہ دار ہے کہتا ہے کہ "ہم دوسروں سے زیادہ زمین اپنے پاس کیوں رکھیں اور کاشتکاروں سے آدھی پیداوار کیوں وصول کریں۔ وہ تو کہتا ہے کہ ہم غریبوں کا لہو تک چوس لیتے ہیں اور اس کے لئے اس نے ایک لفظ Exploitation، (غصب؟) ایجاد کیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ تمہارے منہ سے تو ابھی دودھ کی بو آرہی ہے اور چلے ہو باپ سے زبان لڑانے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ یہ جھوٹی باتیں تم نے کہاں سیکھی ہیں اور یہ نیا لفظ کیا ہے جو تم ہر وقت اوٹا کرتے ہو۔ ہم اس سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ دوسرے دونوں بھائی بھی آگئے اور بہانے سے اُسے الگ بُلا لے گئے۔ ایک گھنٹہ بعد میں نے دیکھا کہ تینوں بدمعاش ایک کونے میں چھپے کچھ مشورے کر رہے ہیں اور اُن کے ساتھ میرے ایک پڑوسی کا لڑکا اور میرے دو کاشتکار بھی ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی اُن لوگوں نے اپنی باتیں ختم کر دیں۔ لیکن ایک لڑکے نے مجھ کو دھوکا دینے کے لئے فوراً ایک فقرہ گڑھ لیا کہ "ہم لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک بیگھہ زمین میں کتنا اناج پیدا ہو سکتا ہے"، گویا میں بالکل اُلّو کا پٹھا ہوں اور کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میں نے بھی جواب دیا کہ "اگر میرے ناخلف لڑکوں کے ہاتھ میں انتظام ہو تو ایک دانہ بھی نہ پیدا ہو"

"ہاں یہ بہت بُرا ہے" ایک اور کسان نے شروع کیا "تم نے سُنا کہ ہوٹسولنگ کے لڑکے کا کیا حشر ہوا؟ اُن لوگوں نے اُس کا تو سر ہی اُڑا دیا اور کہدیا کہ وہ کمیونسٹ تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کمیونسٹ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ناچنے والی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا اور اُس کو لے بھاگنا چاہتا تھا اور اُسی لڑکی پر پولیس کے افسر اعلیٰ کا لڑکا بھی لٹو تھا وہ لڑکی کو نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ وہ سولہ برس کی ہے اور 'ہو' کے لڑکے کی بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اسی بات پر دونوں میں بہت لڑائی ہوئی۔ 'ہو' کا لڑکا اُس کو اپنی بیوی بنانے کی ٹھان چکا تھا یعنی ابھی اُس نے کچھ کیا بھی نہ تھا کہ پولیس نے اُسکو کمیونسٹ کہکر گرفتار کر لیا اور سڑک پر پھانسی دیدی....."

"ہاں، یہ سچ ہے مگر میں نے سُنا ہے کہ وہ واقعی کمیونسٹ بھی تھا" ایک نے کہا

"اور تھا بھی تو کیا ہوا؟" ایک نے سوال کیا "یہ ایسی بری چیز ہے کہ اس کے لئے کسی کی جان لے لی جائے؟"

"خدا مجھ کو محفوظ رکھے" اُس کسان نے گھبرا کر کہا جس نے اپنے تین لڑکوں کا قصہ بیان کیا تھا "کہیں وہ میرا ہی....." اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں نے سُنا ہے کہ لڑکیاں بھی....." ایک دوسرے شخص نے کہا۔

اُس کی آواز میں بھی ارتعاش تھا، جیسے وہ کسی مخدوش زمین پر چل رہا ہو۔ ہوٹل کی نیچے کی منزل سے نئے مہمانوں کی آمد کا شور بلند ہوا اور اس استقبالیہ شور میں بغل کے کمرے کے مہمانوں کی آواز دب گئی۔

(ماخوذ) م - ع

غالب کی ایک رُباعی

آزاد مرحوم نے اپنے مضمون "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں کیا خوب فرمایا ہے:

"غالب اگرچہ پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ ہو گئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

کیا یہ فقرے نہایت جچے تلے اور غالب کی شاعری کے آئینہ دار نہیں؟ اگر اس شاعر اعظم کے ابتدائی دور پر آپ سرسری نظر ڈالیں گے تو بھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی شاعری کا نقارہ بجا کر نہ صرف سادہ مضامین میں عجیب و غریب گونج پیدا کر دی بلکہ انھوں نے جب ناصر علی اور مرزا بیدل کے نامانوس اور اجنبی نقوش کو رنجتہ کے نرم و نازک سانچہ میں ڈھالنا چاہا تو اس "ظلم" پر لوگ چیخ اُٹھے، یہاں تک کہ بعض ان کے کلام کو مہمل کہنے لگے، جسے سُن کر آخر کار غالب کو اپنے استغنا کا یوں اظہار کرنا پڑا:

نہ ستائش کی تمنا: صلہ کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن ..... جو لوگ ان کی شخصیت سے مرعوب اور ان کی علمی و فنی قابلیت کا لوہا مانے ہوئے تھے انکی زبان سے لفظ "مشکل" کے سوا اور کچھ نہ نکل سکا۔ چنانچہ مرزا غالب کی زندگی میں ایک صاحب حکیم آغا جان عیش ایک مشاعرہ میں اپنے خیالات کا اس سے زیادہ اظہار نہ کر سکے کہ:

اگر اپنا کہا تم آپ سمجھے بھی تو کیا سمجھے — مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالباً انھیں چہ میگوئیوں کی طرف غالب نے اپنی اس رباعی میں اشارہ کیا ہے کہ:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کھلم کھلا کم اور دبی زبان سے زیادہ اسی قسم کے اعتراضات غالب پر ہوئے تاہم کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان کے سامنے مقابلہ میں آتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے کلام میں بعض ایسی باتیں رہ گئیں جو کسی طرح ان کے شایانِ نہیں، کون شبہ کر سکتا ہے کہ غالب نہ صرف زبان بلکہ فنونِ شعری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے لیکن کیا ان کا کلام خامیوں اور کمزوریوں سے پاک رہ سکا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے آپ اس رُباعی کو پڑھ لیجئے کہ:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب — دم رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں — سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

اوزان رباعی پر منطبق کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مصرعۂ ثانی میں پورے ایک سبب خفیف کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی اس حالت میں اس کی تقطیع "مفعولن مستفعلن مفاعیلن فع" یا "مفعولن مفعول فاعلاتن فعلن" ہوتی ہے یہ اوزان رباعی سے قطعی خارج ہے اور اس کی صحت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس مصرعہ سے ایک "رک" کم کر کے "مفعولن فاعلن مفاعیلن فع" کے مطابق کر دیا جائے۔ وہ لوگ جو مرزا غالب سے مرعوب ہو کر انھیں سہو و خیال سے پاک و مبرا خیال کرنے پر آمادہ ہیں غالب کی غلطی کو کاتب کے سر تھوپنے میں کسی طرح حق بجانب نہیں کہے جا سکتے۔ اسوقت میرے پیش نظر تقریباً تمام اہم مطبوعہ نسخوں کے علاوہ چند قلمی نسخے ایسے موجود ہیں جن کی چھان بین کرنے کے بعد یقینی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ بچارے کاتب نے نہیں بلکہ خود مرزا غالب نے دھوکا کھایا ہے۔

اسوقت غالب کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ میرے سامنے ہے۔ اگرچہ وہ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید المطابع کے چھپے ہوئے نسخہ کی قلمی نقل ہے لیکن اپنی قدامت کی وجہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نسخہ کے بعد کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۸۵۷ء میں خود مرزا غالب نے اپنی پوری نگرانی میں کتابت کرا کے نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رام پور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد یہی نسخہ مطبع احمدی میں ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں طبع ہوا جس کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خانصاحب الطاف نشاں محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ پر حرف غلط نہ رہا ہو الخ"

اخیر میں غالب کے نام کی مہر کے بعد کی عبارت سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ میں طبع ہوا جس کے اخیر میں غلط نامہ بھی شامل ہے۔ اس اہتمام کے باوجود یہ نسخہ پسندیدۂ غالب نہ بن سکا۔ اس لئے اسی سال وہ پھر مطبع نظامی کانپور میں چھاپا گیا جس کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا کہ:

"بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت و غفران محمد عبد الرحمن بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھاپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خانصاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے باقبال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ مطبع کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا"

اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں منشی شیو نرائن نے اپنے اہتمام سے مطبع مفید خلائق آگرہ میں اس کو چھاپا۔ یہ وہی منشی شیو نرائن ہیں جنکے نام مرزا غالب کے خطوط پائے جاتے ہیں۔

ان نسخوں کے علاوہ کتبخانہ ریاست رام پور میں ایک قلمی نسخہ اور بھی موجود ہے جس کا سرورق نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رام پور کے قلم کی تحریر سے مزین ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عبارت نواب مرحوم کے زمانۂ ولی عہدی کی ہے

اس لئے اس نسخہ کی کتابت کا زمانہ ۱۸۶۵-۶۴ء کے لگ بھگ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ تمام نسخے خواہ وہ مطبوع ہوں یا قلمی ان کی زندگی میں طیار ہوئے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی نسخہ مرزا غالب کی نظروں سے گزرے بغیر رہ سکا ہو۔ ان کے انتقال کے بعد پہلی بار ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں منشی مہانرائن مالک اخبار خیر خواہ ہند و ریختی اخبار نے دیوان غالب کو چشمۂ فیض دہلی میں چھاپا۔

اس زمانہ تک کے تمام نسخوں میں رباعی کے اندر "رک" کی تکرار پائی جاتی ہے جو غالب کی نظروں میں تو خیر کبھی کھٹکی ہی نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ (چونکہ ان کی دھاک چاروں طرف لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی) اس نے دوسروں کی زبانوں پر بھی مہر لگائے رکھی۔ یہاں تک کہ مرحوم مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی کی شرح دیوان غالب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدر آباد طبع ہوئی اور اس وقت پہلی بار زمانہ کو علم ہوا کہ غالب نے اس رباعی کے مصرعۂ ثانی میں کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔

اگرچہ ۱۳۱۷ھ میں حافظ احمد حسن شوکت میرٹھی دیوان غالب کی شرح لکھ چکے تھے لیکن وہ غالباً تحریفات کی سنک میں پوری رباعی کو چھوڑ گئے اور رباعی ان کی دستبرد سے بچ گئی۔ اس کے ۴-۵ سال بعد ہی غالباً ۱۹۰۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے شرح دیوان غالب لکھی جس میں انھوں نے ایک "رک" کو رباعی کے مصرعۂ ثانی سے خارج کر دیا۔ لیکن اس کا سبب بتانے میں وہ بالکل ہی خاموش رہے۔ پھر کیا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے حسرت موہانی کی تقلید میں ایک "رک" کو اڑانا شروع کر دیا۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ غالب کو مورد الزام بناتا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں شرح کے ساتھ دیوان غالب چھپا تو اس رباعی کے ذیل میں شارح نے کس قدر احتیاط کے ساتھ ذیل کی عبارت لکھی ہے کہ:

"اس رباعی کے دوسرے مصرع میں بعض دیوانوں میں "رک" کو بتکرار لکھا ہے جس کی وجہ سے وزن رباعی سے دو حرف زائد ہو جاتے ہیں اور یہ تکرار غلط ہے"۔

اور حضرت عبدالباری آسی نے اپنی شرح میں غالب کی قابلیت سے ڈرتے ہوئے اپنے دماغ پر زور دئے بغیر لکھ مارا کہ:

"رباعی کا دوسرا مصرع اور نسخوں میں "رک رک کر بند ہو گیا"۔ پایا جاتا ہے اور اس صورت میں دو رکن (؟) بڑھتے ہیں مگر غالب کی نسبت ناموزوں کہنے کی جرأت نہیں ہوتی اور ہم اس کو سہو کاتب سمجھ کر صحیح لکھنے کی جرأت کر گئے ہیں"۔

لیکن دیوان غالب مطبوعہ نظامی پریس، دیوان غالب مطبوعہ برلن، غالب نامہ از شیخ محمد اکرام ایم۔اے اور نسخۂ حمیدیہ میں ایک "رک" پر اکتفا کر کے کسی قسم کا نوٹ لکھے بغیر ہی ٹال دیا گیا ہے۔ اس لئے ان نسخوں کو معرض بحث میں لانا بیکار ہے، دیکھنا تو ان دو شارحین کو ہے، جو "بعض نسخوں" اور "سہو کتابت" کی آڑ لیکر اپنی ناجائز غالب پرستی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں حالانکہ تحقیق کی روشنی میں یہ الفاظ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی دیوان غالب مرتبہ خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔اے بیرسٹر ایٹ لا (۱۹۱۹ء) دیوان غالب مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ (۱۹۲۵ء) دیوان غالب مرتبہ چغتائی (۱۹۲۸ء) اور مطالب الغالب از مولانا سہا (۱۹۳۱ء) میں اس رباعی کے دوسرے مصرعہ میں "رک" کی تکرار باقی رہی۔ ہدیۂ سعید میں قاضی سعید الدین احمد ایم۔اے ایل۔ ایل۔ بی۔ لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے غالباً

اس جھگڑے سے الگ تھلگ رہنے کے لئے اس رُباعی کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

اب رہ جاتا ہے صرف طاہر ایڈیشن جس کے متعلق آغا طاہر صاحب کا تحریری دعویٰ ہے کہ "خود مرزا صاحب کے مصدقہ اور قلمی نسخہ کے مطابق" ہے۔ اس کے ساتھ آغا صاحب نے جس عبارت کا بلاک بنوا کر شایع کیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ منقول عنہ نسخہ ۶ رجمادی الثانی ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا اور اس پر مرزا غالب نے "نگارندہ را آفریں و نگرندگاں را نوید" اپنے قلم سے لکھکر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس تحریر کے بموجب منقول عنہ نسخہ ۱۲۷۷ھ کا قلمی ہے لیکن اس میں "درک" کی تکرار نہیں۔ حالانکہ اس کے ایک ہی سال بعد محرم اور ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں دو بار مصنف کی تصحیح کے ساتھ مطبع احمدی دہلی اور نظامی پریس کانپور میں دیوان غالب طبع ہوا اور اس میں "درک" کی تکرار موجود ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ۱۲۷۷ھ میں غالب نے مصرعہ کو درست کردیا تھا تو اس کے دوسرے ہی سال باوجود تصحیح مصنف پھر ایک "درک" زیادہ کیونکر ہوگیا۔ اس لئے یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ طاہر اڈیشن میں کاتب کی اصلاح کارفرما ہے اور غالب سے اس رباعی کے وزن میں قطعی سہو ہوا۔ اور اس کو تسلیم کرکے ہم اس لغزش کا سبب قایم کرنے میں مرحوم نظم طباطبائی کے موید ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھوں نے فرمایا ہے کہ جو عروض فارسی اور اُردو کہنے والوں نے عربی کو ماخذ سمجھ کر اختیار کیا ہے یہ عروض عربی ہی کے لئے خاص ہے۔ اُردو کہنے والوں کو پنگل کے اوزان میں کہنا چاہئے جو ہندی کے اوزان طبعی ہیں اور جن اوزان کو ہم نے اختیار کیا ہے ان میں ہم بہ تکلف شعر کہتے ہیں۔ اسی سبب سے غالب سے شاعر نے بھی ان اوزان پر قابو نہ پایا اور وزن غیر طبعی ہونے کے سبب سے دھوکا کھایا۔

بلاشبہ مختلف زبانوں کے اوزانِ شاعری بھی مختلف ہوتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہر زبان کا خاص لہجہ ہوتا ہے اور اس کے اسماء و افعال کے مخصوص اوزان ہوتے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربی کے اوزان سے پنگل کے اوزان ہماری طبیعت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اس لئے ہم کوئی تھوڑی بہت اس میں ترمیم کرکے ایسے اوزان ترتیب دینا چاہئیں جو اُردو کے اوزان کہے جاسکیں۔ اس کے بعد ہماری شاعری کی وہ عروضی خامیاں جن سے غالب سا شاعر بھی محفوظ نہ رہ سکا دور ہوسکیں گی۔

ساحل بلگرامی

۱۹۴۱ء کی ایک لرزہ خیز تصنیف

ایک ہندوستانی ریاست کے عیاش حکمران کی پرائیویٹ زندگی کے سنسنی خیز واقعات "مورخ کے افسانے" نامی کتاب میں پڑھئے یہ وہی کتاب ہے جسکے شایع ہونے کے بعد مورخ صاحب پر چار مرتبہ حملہ ہوچکا ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ضخامت ۱۳۱ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔

زہریلی مکھی:۔ جناب سید محمود مورخ بی۔ اے مدیر روزنامہ مسلمان دہلی کے دس انتہائی دلچسپ مختصر افسانوں کا مجموعہ، زبان سادہ وسلیس۔ خیالات پاکیزہ اور پلاٹ دلچسپ ہیں۔ ضخامت ۱۴۸ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصولڈاک۔

شہر خموشاں:۔ جناب سید محمود مورخ بی۔ اے کے سات لرزہ خیز سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول:۔ اس میں گاندھی جی۔ سی آر داس۔ مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر کے مختصر مگر جامع حالات تحریر ہیں اور ہندوستانی سیاست پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ ضخامت ۱۲۸ صفحہ۔ قیمت ۸ علاوہ محصول۔ (نوٹ) خریداران نگار ۲۸ دسمبر تک سالکا حوالہ دیکر یہ چاروں کتابیں دو روپے آٹھ آنہ میں منگوا سکتے ہیں۔ البتہ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ منیجر گلفروش پبلشنگ ہاؤس۔ لال کنواں دہلی

اُردو ادب کا سماجی پسِ منظر

(شاہانِ اودھ کے وقت میں)

اُردو شاعری نے دکن میں آنکھیں کھولیں۔ لیکن ابھی اس کی بولی بچوں کی بولی تھی جس کی غلطیاں اور لکنتیں بھی دل کو لبھا لیتی ہیں۔ دلّی میں آکر یہ آواز کھلنے لگی سلجھنے لگی بھرپور ہونے لگی جیسے جیسے یہ آواز بالغ ہوتی گئی۔ اس میں سوجھ بوجھ کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ اس میں گہرائی، پختگی، زندگی کی کسک، شباط کی رنگینی آتی گئی اور نشو و نما پاتی ہوئی ایک شخصیت اس میں جلوہ افروز ہونے لگی۔ اس کا ایک مزاج بنتا گیا۔ وہ اسوقت کے حساس طبقہ کی زندگی کی آئینہ دار بننے لگی۔ لیکن عادل شاہ اور نادر شاہ کے حملوں کے صدمے اُٹھا کر اس زندگی کی چانس اُکھڑ چلی تھی۔ اب یہ زندگی کیا رہ گئی تھی۔ اسے مرزا یگانہ کی زبان سے سنئے:

چارہ نہیں کوئی سلگتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکے کھا کے سنبھلتے رہنے کے سوا

سودا کہتا ہے:۔ "کہا میں آج یہ سودا سے، کیوں ہے ڈانواں ڈول" اگر سودا کی جگہ اگر دلّی پڑھیں تو لفظ ڈانواں ڈول میں ہو اس وقت کے ہندوستان اور اس کی زندگی کا لُبِّ لباب مل جائے گا۔ یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ اگر اُردو شاعری بابر کے زمانہ اور اورنگ زیب کے زمانہ کے درمیان پروان چڑھی ہوتی تو وہ کیسی ہوتی اور کس زندگی کی جھلک دکھاتی۔ بہرحال جب دلّی کی سلطنت کا زوال شروع ہوا تو دلّی میں اُردو شاعری کے دورِ اول کا کمال نظر آتا ہے یعنی اُردو شاعری کا یہ پہلا دور دن آگنے کا نہیں بلکہ دن ڈوبنے کا نغمہ ہے۔ جس طرح کی شاعری اُردو میں عموماً ہوتی رہی ہے۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے اقبال نے کہا ہے:۔ "جو قومیں کچھ کام کر رہی ہیں اُنھیں مذاقِ سخن نہیں ہے"۔ جب قوم نکمی ہوگئی تو شاعری کی طرف مائل ہوئی اُسوقت دلّی میں رہے تو ہوں گے نہ جانے کتنے شعرا جن میں دس بیس کا کلام ہمارے ہاتھ آگیا ہے لیکن ان سیکڑوں شاعروں میں چار نام بہت مشہور ہیں۔ میر۔ سودا۔ درد اور سوز۔

اگرچہ دلّی کے بادشاہ، ارکان سلطنت اور رئیسوں کو کسی قدر اس نئی شاعری کا چسکا لگ چکا تھا پھر بھی نہ تو شاعروں کی روٹی دال درباروں سے چلتی تھی نہ دلّی کی اُردو شاعری درباری شاعری تھی۔ کم سے کم شاعری کی دُنیا ابھی بہت حد تک آزاد تھی۔ پھر بھی اس طرح کام کب تک چلتا بادشاہ اور رؤسا کے درباروں سے قطع نظر کر کے عام اہلِ شہر بھی اب اس عالم میں نہ تھے کہ شعرا کے ساتھ سلوک کر سکیں۔ "ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ابھی اور شاعروں کے پاؤں تو کسی حد تک دلّی میں جمے ہوئے تھے۔ لیکن سوز پہلا شاعر تھا جس کو دلّی چھوڑنی پڑی۔
ملک تو اپنی جگہ پر تھا لیکن دلّی اُجڑ رہی تھی۔ لکھنؤ بس رہا تھا۔ مغل سلطنت کے وزیر ایک ایک کرکے اپنے اپنے صوبوں کے مالک بنتے جا رہے تھے، مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چلا تھا۔ ان صوبوں میں سب سے آباد اور شاداب صوبہ اودھ کا تھا۔ اس صوبہ کے وزیر یا گورنر نواب آصف الدولہ بہادر اگرچہ ابھی تک کہلاتے نواب وزیر ہی تھے اور برائے نام یا برائے رسم اگرچہ وہ شہنشاہ دہلی کو اپنا آقا بھی کہتے تھے۔ لیکن اودھ کے مالکِ کل بن گئے تھے۔ اُن کی حکومت میں صوبۂ اودھ میں ہُن برس رہا تھا۔ زمین سونا اُگل رہی تھی۔ سرکاری خزانہ مالا مال تھا۔ دولت کی دیوی اودھ کی نئی سلطنت سے خوش تھی، یہ سب کچھ تھا لیکن دربار میں کلاونتوں کی کمی تھی۔ شاعری اور دوسرے علوم و فنون ایسی چیز تھے جو سونے پر سہاگہ کا کام کرتے۔ لیکن ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ اس لئے لکھنؤ میں شاعری کا چراغ دلّی کے چراغ سے جلا۔ سوز جب دلّی سے مصیبتیں جھیلتے ہوئے لکھنؤ پہونچے تو نواب آصف الدولہ نے شاعری میں اُنھیں اپنا اُستاد بنایا۔ لیکن بقول آزاد کے "چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ خود دنیا سے گزر گئے۔ نواب کی غزلوں کو دیکھو اُنھیں کا انداز ہے"۔ آزاد نے بات تو ٹھیک لکھی ہے لیکن میں نے نواب آصف الدولہ کی متعدد غزلیں دیکھی ہیں۔ سوز کی غزلوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ ہلکی سی تبدیلی کا خفیف سا احساس ہوتا ہے۔ سوز کی غزلوں کی ٹیس اور کسک، اُن کا کھنچاؤ اور تناؤ ان غزلوں میں کچھ ڈھیلا اور ہلکا پڑ چلا ہے اور خارجیت کہیں کہیں آواز کے رخنوں سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ رنگین خارجیت جو بہت کچھ بن کر اور بہت کچھ بگڑ کر لکھنوی شاعری کی بساطِ ناز پر کھیل کھیلنے والی تھی۔ سوز نے لکھنؤ کا رُخ کیا تو کچھ دنوں بعد سودا اور پھر میر کے پاؤں بھی دلّی سے اُکھڑ گئے اور یکے بعد دیگرے، ان دونوں نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا۔ سودا اگرچہ دلّی کے شاعر تھے اور اگرچہ اُن کی شاعری بھی دلّی کی شاعری تھی لیکن زندہ دلی اور خارجیت کا جو عنصر اُن کے کلام میں تھا وہی عنصر کچھ نکھر کر، کچھ دب کر لکھنؤ کی زندگی، لکھنؤ کے مزاج، لکھنؤ کے دربار اور لکھنؤ کی شاعری کا جزوِ اعظم ہونے والا تھا۔ اب آیئے ذرا لکھنؤ کے نئے شہر اور نئی راجدھانی کے سماجی پسِ منظر پر نظر ڈالیں۔ شہر کی دولت خوش حالی بفکری رونق اور چہل پہل کا کیا کہنا۔ لیکن اُجڑی ہوئی لُٹی ہوئی دلّی کی تہذیب کئی سو برس کی پرانی تہذیب تھی۔ اُس میں خلوص، معصومی، اور معنویت آچکی تھی۔ زندگی کے گہرے سوتے اس تہذیب کو سیراب کر رہے تھے۔ اگرچہ اِن سوتوں میں بہت کم تری رہ گئی تھی۔ پھر دلّی کی زندگی اور تہذیب پر اہلِ باطن اور باصفا فقیروں اور صوفیوں کا حیات بخش اثر تھا۔ وہاں کی شاعری کی گہوارہ جنبانی مظہر جانِ جاناں اور میر درد ایسے روحانیت کے رازداروں نے کی تھی۔ ان تمام صفات سے لکھنؤ کی قلعی شدہ بظاہر چمکتی ہوئی زندگی اور تہذیب محروم تھی۔ باطنیت اور داخلیت کا اس تہذیب میں آسانی سے گزر نہیں تھا۔ مفکروں فقیروں اور اہلِ باطن کی جگہ جید علما نے لے لی تھی۔ بے تکلف فطری نیکیاں جذبات حرکات و سکنات سب میں تکلف اور تصنع کی جھلک ملتی ہے۔ زندگی سرے سے آدابِ مجلس ہو کر رہ گئی تھی اور اس کی تمام بھڑک میں ایک سستاپن تھا۔ خوشی کے میلوں ٹھیلوں میں کوئی گہرا جذباتی عنصر نہیں تھا اور محرم کے دنوں میں بھی کربلا کا واقعہ جو ماتم دلوں میں پیدا کرتا تھا لے دے کے وہ عموماً یہیں تک پہونچتا تھا کہ:

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے — رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے (شاہ حاتم دہلوی)

ماتم بھی ایک جذباتی تعیش بن گیا تھا۔ اس عیش پرستی بناوٹ اور تکلف کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خوشی خوشی رہی نہ غم غم رہا

اور زندگی ایک سطحی چیز ہو کر رہ گئی - میں تو سمجھتا ہوں کہ انحطاط دلّی کی روایتیں اور اُس کے اثرات لکھنؤ کی نئی زندگی میں بھی گھن کی طرح لگ گئے - دلّی کا اُتار اور لکھنؤ کا اُٹھان دونوں ایک مسلسل انحطاط (Continued decadance) کے مختلف نمونے ہیں - ایک پریشان حالی میں انحطاط کا نمونہ ہے دوسرا خوشحالی میں انحطاط کا نمونہ ہے - لچھن دونوں کے بُرے تھے - انجام دونوں کا بُرا ہوا اور قریب قریب ایک ہی وقت - لکھنؤ کی جگمگاہٹ دلّی کی پھیکی روشنی کا خیال کر کے شاعر کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے :

"بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے"

دلّی کی اُداس زندگی میں لکھنؤ کا نشاط ایک حسین وقفہ تھا - بات یہ ہے کہ ہندوستان کا ملک اور ہندوستان کی زندگی اپنی رنگا رنگ نوعیتوں کے باوجود اکھنڈ اور ناقابلِ تقسیم چیز ہے - سنسکرت ادب کا عہدِ زریں وہی زمانہ ہے جب ملک بھر میں بُری بھلی ایک مرکزی حکومت قایم تھی - ہندی ادب میں تلسی داس اور سورداس کا شاندار زمانہ بھی وہی ہے جب اکبر کا راج ملک بھر میں تھا - بنگالی زبان میں ٹیگور اور اُردو میں اقبال بھی اُسی زمانے کی چیزیں ہیں - جب ملک بھر میں ایک ہی حکومت قایم ہے - ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہندوستان ہمیشہ ادھ موا ہو گیا ہے - ہاں مُرغِ بسمل کی وہ تڑپ کہ ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا ضرور اس زمانہ کا ادب بھی دکھائی دیتا ہے - جب ہندوستان کے بند سے بند جدا ہو رہے تھے - چنانچہ لکھنؤ کی زندگی اور شاعری بھی اُسی شکست کی آواز ہے -

ہاں تو وہ چیز جس کو مشہور انگریزی شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ اعلیٰ سنجیدگی (High Seriousness) کہتا ہے لکھنؤ میں نہ آئی تھی اور نہ آ سکتی تھی - سماجی زندگی کے اُس داخلی اور خارجی پس منظر کا لکھنؤ کی شاعری پر اور اُردو ادب پر کیا اثر پڑا ؟ سوز، سودا، میر کے دلّی سے لکھنؤ آنے کا تذکرہ آ چکا ہے - لیکن اُن کے آنے کے پہلے سے خاص لکھنؤ میں اور خاص لکھنؤ کے نواب سے لے کر معمولی طبقہ کے لوگوں میں پچاسوں آدمی ایسے تھے جو شعر کہتے تھے - مشاعرے ہوتے تھے لیکن ابھی لکھنؤ کا رنگ دلّی کے رنگ سے نمایاں طور پر الگ نہ ہوا تھا، ابھی نگاہیں دلّی ہی کے اساتذہ پر اُٹھتی تھیں - اس لئے سوز، سودا اور میر جب آئے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا - نواب اور رؤساء نے اُن کی سرپرستی کی - اُن سب شاعروں کے آگے پیچھے میر حسن بھی دلّی سے لکھنؤ آئے - ابھی خاص لکھنؤ ہی شاعری تو زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہے لیکن لکھنوی زندگی کی خوشحالی اور خارجیت کے کچھ اچھے اور بُرے اثرات دلّی سے آئے ہوئے اُن شعراء کے کلام پر ضرور پڑا - بات یہ تھی کہ لکھنؤ کی شاعری جس ضلع جگت اور خارجیت کے لئے بدنام ہے اُن خرابیوں کے جراثیم خود دلّی کے اہلِ نظر ایسے اشعار کو شاعری کا اعلیٰ نمونہ نہیں سمجھتے تھے اور لکھنؤ والے زبان کی شاعری پر جان دینے لگے تھے - لکھنؤ پہونچ کر میر کی نظر میں بھی ضلع جگت کی اہمیت بڑھ گئی - لیکن خارجیت نے فایدہ پہونچایا وہ یہ کہ غزلوں سے اُردو شاعری آگے بڑھی میر کی کئی مثنویاں اُن کے قیام لکھنؤ کی یادگار ہیں -

میر حسن جب تک دلّی میں تھے صرف نرم و نازک غزلیں کہتے تھے، لکھنؤ کی کھلی اور بھری فضا میں آ کر ہی اُنھوں نے مثنوی بدرِ منیر لکھی - جس طرح ناٹک یا ناول لکھنے کے لئے شاعر یا مصنف کو اپنی شخصیت سے باہر آنا پڑتا ہے اور اس رنگا رنگ عالم پر نظر ڈالنا پڑتی ہے اسی طرح مثنوی لکھنے کے لئے بھی آپ بیتی سے گزر کر جگ بیتی کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے - لکھنؤ کی زندگی کی خوشحالی اور خارجیت نے ہماری شاعری کی لغت میں وسعت دی اور یہ مثنوی اسی زندگی کی دین ہے - اُردو سے پہلے بھی

دلّی اور دلّی کے اطراف کی شاعری کا مقابلہ اگر اودھ کی شاعری سے کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی فضا مسلسل نظموں کے لئے زیادہ موزوں تھی اور دلّی و اطراف دلّی کی فضا میں غزلیت زیادہ تھی۔ سورداس نے غزلیں یا بھجن لکھے مگر ملک محمد جائسی اور تلسی داس نے اور آلھا کے مصنف نے مسلسل نظمیں لکھیں۔ نظیر اکبر آبادی ضرور آگرہ کے تھے اور اُردو کے وہ پہلے نظم گو شاعر ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں اطراف دلّی کی حدیں بڑھکر گویا پورے ہندوستان کی حدیں بن گئی ہیں۔ مگر اسوقت تو ہم آپ لکھنؤ میں ہیں میں نے برابر یہ محسوس کیا ہے کہ دہلوی شعراء کے شعور میں پورے ہندوستان کی زندگی موجزن ہے اور لکھنوی شعراء کے محدود شعور میں صرف لکھنؤ کی آبادی ہے اور لکھنؤ کی زندگی ہے۔

میر تو مثنویوں میں بھی عموماً آپ بیتی ہی کہتے ہیں۔ لیکن میر حسن نے جاگیردارانہ (Feudal) زندگی کی اچھی خاصی جیتی جاگتی تصویر مثنوی سحر البیان میں پیش کردی ہے۔ اور اس کے لئے دلّی اور لکھنؤ کی جاگیردارانہ (Feudal) زندگی کے دور انحطاط کا سماجی پس منظر ضروری تھا۔ اس مثنوی کے لکھنے کی تحریک بھی جبھی تھی کہ یہ زندگی خوشحال اور فارغ البال نظر آئے جیسا وہ لکھنؤ میں نظر آرہی تھی۔ جہاں تک سودا کے کارناموں کا تعلق ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا، کم سے کم مجھے یہ معلوم ہوا کہ دبستان دہلی کے پیشوا خان آرزو سے متاثر ہونے والے اُن کے بعد کے شعرا میں سودا کے اُستاد شاہ حاتم تنہا شخص تھے جن کا تخیل اور مزاج خارجی شاعری اور اس کی رنگینیوں کی طرف مائل تھا اگر ہم دلّی کو داخلیت کا سرچشمہ اور لکھنؤ کو خارجیت کا سرچشمہ سمجھیں تو ہمیں دلّی اور لکھنؤ کا سراغ ہندوستان کے نقشے میں ملنے کی بجائے مختلف مزاج کے آدمیوں کے دلوں میں ملیگا۔ دلّی اور لکھنؤ ہمارے دلوں میں ہیں اس طرح دبستان لکھنؤ کی بنیاد شاہ حاتم کے دل میں اور اُن کی شاعری میں تھی اور اُنکے خاندان کے شاعروں کے دلوں میں تھی۔ یعنی لکھنؤ کے وجود سے پہلے ہی سے لکھنوی شاعری کی طرح دلّی میں پڑ چکی تھی، جب لکھنؤ بسا تو وہاں کی زندگی نے شاعری کے اس رنگ کو اور چمکایا اُبھارا اور نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ سودا جب لکھنؤ آئے تو اُنکی غزلگوئی جس میں شاہ حاتم کی غزلگوئی نہایت بافروغ اور ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی لکھنؤ میں بہت مشہور ہوگئی۔ سودا کی غزلیں سنکر اہل لکھنؤ کا یہ حال تھا کہ:

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن پھر بھی سودا، دلّی کا شاعر تھا اس کی خارجیت میں بھی عموماً وہ رس وہ گہرائی وہ وزن اور وہ بات ہے جو لکھنؤ کی غزلگوئی میں نہیں ملتی اگرچہ وہ سطحی تقلید سودا کی غزلگوئی کی ہے۔ اس غزلگوئی میں سودا کا رنگ سودا سے تیز ہے لیکن سودا کی غزلوں کا رس یہاں پھیکا ملیگا۔ خارجیت بھی داخلی اور خارجی ہوتی ہے۔ یہاں بھی معاملہ تہ در تہ ہے۔ سودا کی ہجو میں بھی اسی لکھنوی مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ لائے تو یہ چیز اپنے ساتھ دلی سے لیکن جتنا اُس سے حضرات لکھنؤ پھڑک اُٹھے اتنے بے اختیار اہل دہلی نہیں ہوئے تھے۔ سودا کی ہجوؤں کا جتنا اثر لکھنؤ کی غزلگوئی پر پڑا اتنا سودا کی غزلوں کا بھی نہ پڑا۔ سودا کی ہجو لکھنؤ کی غزل گوئی کے اُس حصہ پر اثر انداز ہے جس میں معشوق اور رقیب دونوں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ دونوں پر پھبتیاں کسی گئی ہیں اہل لکھنؤ کے اِن قطعات میں واسوختوں اور اِن مسلسل غزلوں میں سودا کی ہجو جلوہ گر نظر آئے گی جن میں معشوق کی وہ وہ درگت اور فضیحت ہوئی ہے کہ توبہ!۔ نواب آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں تخت پر بیٹھے۔ لکھنؤ کی زندگی کا بناؤ چناؤ وہاں کے بانکے ترچھے، وہاں کی مضحکہ خیز اکڑ، اس زندگی کی ظاہر چمک دمک اور حقیقی سنجیدگی کا فقدان یعنی بگڑوں کے اور

بگڑ جانے کا منظر نظر آتا ہے۔ سوز۔ میر۔ سودا کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اب جرأت، مصحفی اور انشا کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلے دربار پر نظر ڈالئے کیونکہ سماجی زندگی کے پس منظر کا دربار پیش نظر تھا۔ حیرت ہوئی کہ آخری تاجدار دلی بہادر شاہ ظفر کے لٹے ہوئے دربار کے حالات پڑھنے پر تو شاہی شان و شوکت نہ سہی لیکن ایک رعب اور دبدبہ کا اثر دلوں پر پڑتا ہے۔ لیکن اودھ کے دربار کا حال پڑھکر نواب سے انشا کی وہ نقالیاں وہ سستی اور بے مغز اور غیر حقیقی ظرافت و بزلہ سنجی سے کوسوں دور سستی باتیں نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ جن کو پڑھکر بالکل ہنسی نہیں آتی۔ کیونکہ ہنسی مذاق کے لئے بھی معنویت اور داخلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں یہاں ناپید۔ وہ باتیں اور چھیڑ چھاڑ جن میں طرفین کو سنجیدہ ہونے کی توفیق بھی نہیں عطا ہوئی ان سب سے ایک ایسی محفل کا پتہ چلتا ہے جس میں لوگ ہنسنا چاہتے ہیں اور ہنسنا نہیں آتا رونا چاہتے ہیں لیکن رونا نہیں آتا۔ شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے وقت کی زندگی سے ذرا برتر اور بلند ہوں ایک وہ جو اس زندگی کے سب سے متبذل حصے کو چمکائیں۔ مصحفی لکھنؤ میں آکر بھی دلی اور لکھنؤ کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہی نرمی، وہی اعتدال، وہی رچی ہوئی رنگینی جو دلی والوں کے یہاں ہے۔ مصحفی کی غزلوں اور ان کے قصیدوں میں ملتی ہے۔ لکھنؤ کی رنگینی خارجیت نے بھی مصحفی کو بنایا۔ کہیں کہیں بگاڑا بھی لیکن جو خارجیت سودا کے یہاں دبی دبی سی تھی اسے مصحفی نے اس طرح چمکایا کہ ہم اُسے حواس خمسہ کا شاعر (Poet of the Sense) کہہ سکتے ہیں۔ خاص کر احساس رنگ (Sense of Colour) جیسا مصحفی کو تھا کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی پُر تکلف گفتگو نے لکھنؤ کی بات چیت میں جو ٹھسّا تھا وہ صفات جلول ہو کر ان ابیلے اور رواں دواں اشعار میں نمایاں ہیں جن میں مصحفی نے اکثر پتھر کو پانی کر کے دکھا دیا ہے۔ جرأت نے بھی سماجی پس منظر کا بنے ہوئے رنگ میں اثر لیا نہ کہ بگڑے ہوئے رنگ میں یعنی شدید اور پُر خلوص جنسی محبت کی جگہ اہل لکھنؤ کی زندگی میں محبت کی نقالی اور خود بینی نے لے لی تھی۔ جرأت نے اس زندگی کے خارجی حرکات و سکنات یعنی اس کی معاملہ بندی، اتنی صحیح کی ہے کہ شاعری نے مصوری کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ دیوان جرأت کے صفحات کے سیمیں پردوں پر عشقیہ زندگی کی سطحی مگر چلتی پھرتی ہنستی بولتی تصویر نظر آتی ہے جو سچی بھی ہے اور دلکش بھی جس کی خارجیت میں داخلی جذبات کی ہلکی سی چاشنی ہے جرأت کی شاعری اور جرأت کے رنگ کی شاعری صرف لکھنؤ میں پیدا ہو سکتی تھی۔ لکھنؤ کی زندگی کے سماجی پس منظر کے بغیر جرأت کی شاعری ناممکن تھی۔ انشا کے متعلق میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے بلکہ رائے نہیں یقین اور احساس رہا ہے کہ اگرچہ وہ اپنی ظرافت کے لئے مشہور ہیں اپنی منہ پھٹ شاعری کے لئے مشہور ہیں لیکن انھیں سب کچھ آتا تھا، سوا ظرافت کے انھیں سب کچھ آتا تھا لیکن ان میں یہ سلیقہ نہ تھا کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ کس بات پر کس خیال پر کس موقعہ پر ہنسنا چاہئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انشا نہ مصحفی تھے نہ جرأت بلکہ اس طرح کے شاعر تھے جو وقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ ان میں ایک غیر معمولی ذہانت اور طباعی تھی اس لئے اپنے کلام کے اس حصہ میں جو مزاحیہ نہیں ہے انھوں نے ایک خاص انداز پیدا کیا ہے سودا اور میر کے بعد صرف انشا ایسا شاعر ہے جو نمایاں طور پر صاحب طرز ہے اُردو شاعری میں شاید ہی انشا ہی تنہا شخص ہے جسے ہم (Poet of Humour) کہہ سکیں، دلی اور لکھنؤ کی سماجی زندگی اور شاعری میں یہ فرق بھی قابل توجہ ہے کہ دلی کے شعرا میں حریفانہ لاگ ڈانٹ نے وہ صورت اختیار نہ کی جو لکھنؤ میں محض لکھنوی زندگی کی سطحیت، روحانی بے باکی اور جو محض ایک باطل نظریۂ زندگی کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔ مصحفی اور انشا کے معرکوں کے پہلے سودا اور میر نا آخر کیں اور اُن کے طرفداروں کے معرکے آب حیات میں پڑھئے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا سماجی پس منظر دھوکے کی ٹٹی تھی اور اس کی متاع زندگی لے دے کر (Treachery) رہ گئی تھی۔ لوگ اُس زمانہ کے لکھنؤ کی بذلہ سنجی اور ظرافت کی داد دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے اور بچپن ہی سے ایسا محسوس کیا ہے کہ ان بدنصیبوں کو شوخی شرارت ہنسنا ہنسانا آتا ہی نہیں تھا ان سب چیزوں کے لئے دماغ چاہئے۔ علم زندگی چاہئے اور یہ سب وہاں سرے سے ندارد۔ بہرحال جرأت۔ مصحفی۔ انشا کی ہستیاں اپنے وقت کے لوگوں سے بلند ہستیاں تھیں اور اپنے وقت کے کمال نازوال کو بھی کچھ اُبھار گئیں کچھ بگڑے ہوئے عناصر کا بناؤ دکھا گئیں۔ کچھ رنگ دکھا گئیں، کچھ رنگ اڑا گئیں کچھ رنگ جما گئیں۔

اُردو نثر بھی اُس زمانے میں پر پُرزے نکالتی ہے۔ جس کی یادگار انشا کی لکھی ہوئی رانی کیتکی کی کہانی اور دریائے لطافت ہے۔ جو اُردو کی پہلی قواعد ہے ایک بگڑے ہوئے زمانے میں ایک بگڑے ہوئے شاعر نے ایک بگڑی ہوئی چیز کا اُردو شاعری میں اضافہ کیا یعنی سعادت یار خاں رنگین نے ریختی کہی۔ یہ وہی حضرت ہیں کہ جب انھوں نے میر کا شاگرد ہونا چاہا تو میر نے اُن کا کلام سُن کر کہا:۔

"صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیرزادے ہیں، نیزہ بازی، تیراندازی کی کثرت کیجئے، شہسواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری دلخراشی اور جگرسوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں"

اب جرأت، مصحفی اور انشا کا دور بھی ختم ہوتا ہے۔ ابھی نوابانِ اودھ کی سلطنت قایم ہے۔ اب غازی الدین اور اُن کے بعد نصیرالدین تخت نشین ہوتے ہیں اور لکھنؤ کی زندگی اور شاعری بھی۔ دلّی کی شاعری اور لکھنؤ کی شاعری دونوں کا سماجی پس منظر شہر میں رہنے والے رؤسا، اُمرا اور اوسط درجہ کے لوگوں کی زندگی ہے۔ صرف نظیر اکبرآبادی وہ تنہا شخص تھا جس نے اُردو ادب کو کم سے کم شہر میں رہنے والے عوام کی زندگی سے روشناس کیا۔ ورنہ یاد رہے کہ شروع سے اب تک اُردو ادب اور اُردو شاعری کا سماجی پس منظر پورے ہندوستان کی سماجی زندگی نہیں رہی ہے۔

پریم چند اور اُن کے مقلدوں نے اُردو نثر میں ضرور اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن یہ تو بہت بعد کو ہوا۔ جرأت۔ مصحفی، انشا۔ اور رنگین کے بعد ناسخ اور آتش آتے ہیں۔ دونوں نے صرف غزلیں کہی ہیں اور ان کی غزلوں میں بھی مختلف پہلوؤں سے لکھنؤ کی زندگی کا پس منظر نظر آتا ہے۔ ناسخ نے زبان کو بہت کچھ بنایا اور شاعری کو بہت کچھ بگاڑا۔

آتش نے جہاں وہ ناسخ کی پیروی سے بچ گئے ہیں زبان اور شاعری دونوں کو بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب لکھنؤ کی زندگی میں اگرچہ پرانی رنگ رلیاں قایم تھیں لیکن خارجی اور داخلی طور پر کچھ سنجیدگی آچلی ہے۔ آتش کی غزل میں سنجیدگی اور بانکپن کا وہ امتزاج ملتا ہے جو صرف لکھنؤ میں ممکن تھا، اس لکھنؤ میں جو اپنے عہدِ طفولیت سے سن شعور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زندگی کا سماجی پس منظر بدل رہا تھا۔ اسی سے آتش کی شاعری کے تیور اور انداز بھی بدلے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر لکھنؤ کے پورے لٹریچر میں سے ہمیں ایک چیز لینی ہو تو ہم بلا تامل مثنوی گلزار نسیم کو لیں گے جس کے کئی ہزار اشعار میں لکھنؤ کا مزاج، نظریہ، شاعری، انداز بیان، لکھنؤ کی تہذیب، نفاست اور لطافت سب جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

نسیم کے بعد بھی لکھنؤ کی لکھنویت قایم رہی۔ انیس اور دبیر اور اُن کے بعد کے شعرا نے بہت کچھ لکھنؤ کے رنگ کو چمکایا۔ لیکن اگر کوئی ایک تصنیف لکھنؤ کے رنگ شاعری کی نمایندگی کر سکتی ہے تو وہ گلزار نسیم ہے۔

(منشور لاسلکی لکھنؤ)

فراق گورکھپوری ایم۔اے

مکتوبات نیاز

بجا ارشاد ہوا - لیکن آپ کو کیا خبر کہ ابھی تو یہاں کہنے کو دفتر کا دفتر پڑا ہوا ہے - اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی پہلا ورق تمام نہیں ہوا !

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھولکر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

گھبرائیے نہیں، وہ وقت دور نہیں جب یہ "قصرِ جہل" مٹ کر رہے گا اور انسانیت کا چہرہ اس غبار کے اندر سے مسکراتا ہوا نظر آئے گا !

ہمیں نہیں معلوم دُنیا اس سے پہلے کتنی مرتبہ تباہ ہو ہو کر پھر آباد ہوئی ہے، لیکن اب فطرت کی ان اٹھکیلیوں کو ختم ہونا ہے - یا تو اسے برباد ہو کر اب سنورنا نہیں، یا اگر سنور گئی تو پھر برباد ہونا نہیں - یہ برزخی دور اب اپنی آخری گھڑیوں سے گزر رہا ہے اور وہ ساعت قریب ہے جب اہرمن و یزداں میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہو جانا ہے !

اُف رے تجاہل ! آپ جو کچھ چاہتی ہیں، وہ ہو چکا، لیکن آپ کو کسی طرح اس کا یقین تو آئے

کہ سعدی از پئے جاناں برفت و جاں انداخت !

مسکرائیے نہیں - زخم کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں، اور پھر وہ گھڑی سامنے آجاتی ہے جب

تغافل از تو می بارید و حسرت می چکید از من !

میں نے پہلے بھی کبھی "شیوۂ عشق" کی طرف سے کوئی معذرت بارگاہ حُسن میں پیش نہیں کی تھی اور اب بھی اس کا یارا نہیں - اس لئے اس طنز سے کیا فایدہ کہ

ایں آتشِ نیرنگ نہ سوزد ہمہ کس را

جلکر خاک ہو جانے والوں سے بھی آپ کی محبت کا تماشہ دیکھ چکا ہوں اور پروانوں کی طرح تڑپنے والوں سے بھی! لیکن آپ کو شاید اس کا علم نہیں کہ

خاطر پروانہ از ہر آتشے خرسند نیست

اس سے مراد آپ کے پندارِ حُسن کو صدمہ پہونچانا نہیں، بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ آپ اگر کسی سے

محبت کریں بھی تو نتیجہ معلوم !

بود محبت ناداں بلاکہ یوسف را
طرب سرائے زلیخا تمام زنداں ست !

اس مرتبہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، اسے پھر لکھئے، شاید اب کے یقین آجائے !

مکرمی - زحمت تو ہوگی، لیکن کسی دن وقت نکال کر، پروفیسر صاحب سے مل لیجئے اور اُن سے صرف اتنا پوچھ لیجئے کہ کیا میرے چار خطوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں پہونچا - اگر وہ کہیں کہ "نہیں"، تو فوراً اُلٹے قدم واپس آجائیے اور کچھ نہ کہئے، لیکن اگر وہ خط پہونچنے کا اقرار کریں، تو ان سے دریافت کیجئے کیا وہ مجھ سے خفا ہیں اور خفا ہیں تو کیوں ؟

حیرت ہے کہ یہ لوگ کالجوں اور اسکولوں میں طلبہ کو کیا درسِ اخلاق دیتے ہوں گے اور آیندہ نسل کی طرف سے دنیا کو کیا توقع ہوسکتی ہے - میں ابھی آپ کو نہ لکھوں گا کہ میں نے انھیں کیا لکھا تھا اور وہ کیوں جواب نہیں دیتے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ میں آپ کو اطلاع دوں گا اور شاید آپ یہ سُنکر حیران رہجائیں گے کہ وہ اپنے کتنے مکروہ جُرم کو اپنی خاموشی سے چھپانا چاہتے ہیں -

اگر ممکن ہو تو یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ وہ اس دوران میں کہیں باہر تو نہیں جا رہے ہیں - شاید میں خود آسکوں

بندہ نواز - آپ نے بھی کن لوگوں کا ذکر کیا - ان میں سے کس کو کس پر ترجیح دیجائے ؟

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

اس سے زیادہ اگر آپ کو حال معلوم کرنا ہے تو باسط صاحب سے پوچھئے، ورنہ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ خود تجربہ کیجئے - حماقت تو ہوگی لیکن بہت کار آمد، کیونکہ اس طرح آپ حق الیقین کے درجہ تک پہونچ جائیں گے

حیرت ہے کہ جب میں آپ کو ایک بار لکھ چکا تھا، تو پھر آپ نے دوبارہ کیوں دریافت کیا - شاید آپ کو یقین نہ آیا تھا - بہرحال اس باب میں اب مجھ سے مزید استفسار کی ضرورت نہیں - میں اپنی رائے پر اب بھی قایم ہوں، آپ کو تامل ہو تو خود تحقیق کیجئے، ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز میرے لئے زہر ہو اور آپ کے لئے تریاق !

جناب بندہ - اس کا کیا علاج کہ آپ صرف "عریاں تنی" کو کمال سمجھتے ہیں اور میں

دامانِ چاک چاک و گریباں دریدہ را

اُس میں پھر بھی ہوش کا شائبہ موجود ہے ! ——— آپ مجھ سے کپڑے اُتار کر کھُل کھیلنے کو کہتے ہیں اور میں ایک ایک تار کا حساب لینا چاہتا ہوں - اُدھر ایک ایک رگ میں نشتر چبھونا اور اِدھر ایک ایک رگ سے پھانس نکالنا !

آپ اس کی لذت سے واقف نہیں - براہ راست خدا سے معاملہ رکھنے والوں کا یہی دستور ہے - آپ کو ہادی ذرایع کی ضرورت ہے، اس لئے یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی !

مکرمی - جلالؔ اسیر واقعی اچھا شاعر تھا - ضرور اس کا مطالعہ کیجئے، لیکن عرفی کا سا جمال اس میں کہاں، اسیر کے چند اشعار مجھے یاد ہیں، آپ کے انتخاب میں نہ آئے ہوں تو لکھ لیجئے :-

اسیر از دوست پرسیدن چہ حاجت سوائے را کہ دشنامش جواب ست

.....

تیغ بر کف، بادہ در سر، خندہ پنہاں زیر لب از برائے جانِ ما خوش محفلے آراستند

.....

دل را در آتش افگنم و بوئے او می کنم منت نمی تواں ز نسیم و صبا کشید

.....

از غبار شوق طرح کعبۂ دل ریختند گردِ رہ برداشتند و رنگِ منزل ریختند

.....

اُلفت نمی کنند بہ کس دل دویدہ ہا گلچیں نمی شوند جراحت گزیدہ ہا

.....

شمع را ہمدرد بلبل کرد عشق برگ گل چید و پرِ پروانہ ساخت

.....

زاہد کہ گزشتہ از دو عالم از خود چہ قدر گزشتہ باشد

.....

لیکن جلالؔ اسیر کے یہ تمام اشعار ایک طرف اور عرفی کا یہ شعر ایک طرف :

خوش آنکہ پیش تو پرسند حالِ عرفی واد شکایتے بہ کنایت ز روزگار کند

ایک اور شعر سن لیجئے :

نہ گویمت بنشین در قدح شراب انداز کرشمہ کن و یک شہر را خراب انداز

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں - یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا اور فنِ شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے - قیمت علاوہ محصول، دو روپیہ آٹھ آنے -

مینجر نگار - لکھنؤ

وقت کی باتیں

ایک آہنی عزم وارادہ کا انسان

(اسٹالین)

سترہ کروڑ روسی آبادی کا قایداعظم، جو اسوقت ہٹلر کے مقابلہ میں صف آرا ہے اور جس کی کامیابی پر نہ صرف اشتراکیت کی زندگی بلکہ یورپ کی تمام حکومتوں کی آزادی منحصر ہے۔ دنیا کے اُن چند انسانوں میں سے ہے، جن کی ابتدائی زندگی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کو آخر میں یہ کچھ ہونا ہے اور جن کی کامیابی اتفاق سے زیادہ خود انسانی عزم وارادہ کی پختگی کی رہین منت ہے۔

اب سے نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ۱۸۷۹ء میں ایک لڑکا جوزف نامی طفلس کی سرزمین پر پیدا ہوتا ہے اور ایک ایسے غریب خاندان میں جس کی روزی کا سہارا صرف جوتے بنا بنا کر بیچنا تھا۔

جوزف کے باپ کی خواہش تھی کہ اس کا لڑکا مذہبی تعلیم حاصل کرکے پادری بنے، لیکن یہ دبلا پتلا مگر خود سر لڑکا اسکول میں مذہبی کتابوں کے بجائے علوم وفنون کی کتابوں اور انقلابی لٹریچر پر زیادہ توجہ صرف کرتا، اس لئے وہ ۱۸۹۸ء میں اسکول سے نکالا گیا۔ اسوقت طفلس میں روسی مزدوروں کی ایک انجمن قایم تھی، یہ اس میں شامل ہوگیا۔ یہاں اس نے بہت جلد غیر معمولی عزت حاصل کرلی اور انقلاب پیدا کرنے کے جرم میں چھ مرتبہ گرفتار کرکے سائبیریا بھیجا گیا۔ یہ ہر مرتبہ قید سے بھاگ کر باہر نکل آیا اور ہر مرتبہ ایک نیا نام اختیار کیا آخری نام اسٹالین تھا۔

جب یہ سائبیریا کی طرف جلاوطن کیا جاتا تو وہاں بھی بیکار نہ بیٹھتا بلکہ انقلابی جماعت کے آدمیوں سے ملتا رہتا۔ پولیس اس کا پیچھا کرتی اور یہ ہمیشہ کسی نہ کسی تدبیر سے بھاگ نکلتا۔ یہ اپنے جلسوں کے لئے بہت پوشیدہ مقامات تجویز کرتا اور وہیں مزدوروں کو بلاکر انقلاب کی دعوت دیتا۔ چنانچہ جارجیا میں یہ جلسے ایک مسلم قبرستان میں ہوا کرتے جہاں کا گورکن، اسٹالین کا دوست تھا۔

ایکبار اسٹالین کو معلوم ہوا کہ پولیس اس کے پریس کی جستجو کر رہی ہے، اس نے پریس اور ٹائپ وغیرہ سب اسی گورکن کو دیدئے۔ اس نے اپنے ایک اور دوست قاسم نامی کے سپرد کردیا اور اس طرح اسٹالین کا پریس پولیس کے ہاتھ نہ آسکا۔

قاسم کاشتکار تھا اور اسی کے گھر پر اسٹالین اور گورکن جمع ہوکر باتیں کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ قاسم کو بھی تحریک انقلاب سے دلچسپی پیدا ہونے لگی اور آخرکار وہ انقلاب کا بڑا حامی ہوگیا۔ اب اسی کے مکان میں پریس قایم کیا گیا جہاں پریس کے آدمی عورتوں کا بھیس بدلکر برقعوں میں آتے اور یہیں سے انقلابی لٹریچر کی اشاعت کی جاتی۔

قاسم ہر صبح کو ترکاریوں کا ٹوکرا لیکر باہر نکلتا جس میں پھلوں کے نیچے انقلابی اشتہارات واعلانات چھپے رہتے۔ یہ کارخانوں میں پہونچکر مزدوروں کے ہاتھ پھل وغیرہ فروخت کرتا اور انھیں اشتہارات میں لپیٹ کر حوالہ کردیتا۔

یوں تو اسٹالین اور لینن کی رسم وراہ خط وکتابت کے ذریعہ سے ۱۹۰۳ء ہی میں ہوچکی تھی لیکن ملاقات سب سے پہلے ۱۹۰۵ء

میں ہوئی، جب فنلینڈ کی بالشویک کانفرنس میں ان دونوں کا اجتماع ہوا۔ اس ملاقات کا حال خود اسٹالین کی زبان سے سنئے، وہ کہتا ہے کہ:- "میں خیال کرتا تھا کہ لینن اپنی جسامت کے لحاظ سے دیوپیکر انسان ہوگا، اس لئے جب میں جلسہ میں پہونچا تو اور بہت سے لوگ جمع تھے، لیکن لینن مجھے نظر نہ آیا۔ وہ لینن جس کی خاص تصویر میں نے اپنے ذہن میں قایم کی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب وہ یہاں آئیگا تو ہر طرف سناٹا چھا جائے گا، لوگ مودب کھڑے ہو جائیں گے اور ہر شخص کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھی ہوئی ہوں گی۔ لیکن جب دیر تک کوئی ایسا انسان نہیں آیا تو میں نے پوچھا کہ لینن کب تک آئے گا؟ اس کے جواب میں ایک شخص نے حیرت سے پوچھا کیا تم لینن کو نہیں جانتے وہ کیا کھڑا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا دیوپیکر لینن، نہایت ہی معمولی جسم کا انسان تھا اور لوگوں سے اس طرح بے تکلفانہ باتیں کر رہا تھا گویا وہ بھی انھیں میں سے ایک ہے، اس کی اس سادگی نے مجھ پر بڑا اثر کیا اور میں ہمیشہ کے لئے اسکا گرویدہ ہو گیا۔"

اسٹالین نے انقلاب روس میں جتنا نمایاں حصہ لیا اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ دو مرتبہ اسے (Red Flag) کا تمغہ ملا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک جنگی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے اس نے کام کیا۔

انقلاب کے بعد یہ زیادہ تر پیٹرسبرگ ہی میں رہا اور لینن کے مددگار ہونے کی حیثیت سے وہیں کام کرتا رہا۔ اسوقت لینن کا ایک اور شیر ٹراٹسکی بھی تھا، لیکن ٹراٹسکی زیادہ تر چل پھر کر تقریریں کیا کرتا تھا اور اسٹالین مرکز ہی میں رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹالین کو پارٹی میں زیادہ دخل حاصل ہو گیا اور جب ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو لینن کا انتقال ہوا تو اشتراکی جماعت کی امیدیں زیادہ تر اسی سے وابستہ ہو گئیں یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ سکریٹری جنرل ہو گیا۔

اسٹالین کی پرائویٹ زندگی بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کی بیوی تین بچے چھوڑ کر ۱۹۳۲ء میں مر چکی ہے اور اسٹالین انھیں کے ساتھ کریملن[1] کے ایک چھوٹے سے سہ منزلہ مکان میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس مکان میں ایک کھانے کا کمرہ ہے، ایک چھوٹا سا ہال ہے اور تین خوابگاہ۔ اور یہ سب نہایت معمولی فرنیچر رکھتے ہیں۔ دونوں بیٹے رات کو کھانے ہی کے کمرے میں رہتے ہیں اور لڑکی ایک علٰحدہ کمرے میں۔ کھانا پاس کے ہوٹل سے آجاتا ہے اور اسٹالین معہ اپنے تینوں بچوں کے اسی پر قناعت کرتا ہے۔

یہ ہے وہ سادہ انسان جو اس وقت روس کا ڈکٹیٹر اور تمام روسی آبادی کا محبوب لیڈر ہے۔ لینن نے چاہا تھا کہ اس کے بعد کلی نن پریسیڈنٹ مقرر کیا جائے اور وار شلاف کمانڈر انچیف، لیکن اسٹالین کے اقتدار نے یہ بات پوری ہونے نہ دی اور ٹراٹسکی کو بھی آخر کار وہاں سے جلاوطن ہونا پڑا۔

اسٹالین بہت کم بولتا ہے، وہ خطیب و مقرر نہیں ہے، لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے اس سے مضبوطی ارادہ و فراست ضرور ظاہر ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کا مقابلہ کرنے میں ہٹلر کو اس قدر دشواریاں پیش آرہی ہیں۔

دودھ اور سائنس

سیکڑوں برس سے دنیا یہی سمجھتی آرہی تھی کہ دودھ صرف پینے کی چیز ہے، لیکن آج ہم اسے کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں اور اس پر سوار بھی ہو سکتے ہیں، ہم اس کے قلم بنا کر لکھ سکتے ہیں، اسکے بٹن اپنے کوٹوں میں لگا سکتے ہیں اور پہیے بنا کر ان کو سواری کے کام میں بھی لا سکتے ہیں۔ ایک گلاس جس میں آپ پانی پیتے ہیں، ایک فانوس جسکے نیچے شمع روشن رہتی ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں ایک گیلن دودھ کی شکل میں پائے جاتے ہوں۔

سائنس نے دودھ کی بہت سی چیزیں بنائی ہیں، انھیں میں سے ایک وہ ہے جسے (Lanital) کہتے ہیں،

---

[1] کریملن، ماسکو کے اس محل کا نام ہے جہاں زار رہا کرتے تھے لیکن اب یہاں سوویٹ حکومت کے اجلاس ہوتے ہیں۔

یعنی "دودھ کا اُون"۔ دودھ سے کپڑا طیار کرنا بظاہر بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے ـــــ چار سال پہلے کی بات ہے کہ اٹلی کا ایک شخص لندن کی سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر آیا۔ جو کپڑے کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، لیکن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ دودھ کا بنا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ چند مہینے قبل بھی میں، ایسا ہی ایک سوٹ پہن کر آیا تھا جو مہ بوتل دودھ سے طیار ہوا تھا۔ جب اس کی خبر واشنگٹن پہونچی تو وہاں کے ماہرین علم الکیمیا نے تحقیق شروع کی اور آخرکار (Lanital) طیار کر کے پیٹنٹ کرا لیا گیا۔

بنانے کی ترکیب بہت معمولی ہے۔ دودھ سے Casein یا (جبن) نکال کر اسے ایک خاص قسم کی چھلنی کے اندر سے گزارتے ہیں جس سے ریشے بن جاتے ہیں اور ان ریشوں کو کاٹ کر کپڑا طیار کیا جاتا ہے۔

دودھ سے نہ صرف کپڑا طیار ہوتا ہے بلکہ بٹن اور Wheel - Steering بھی بن سکتے ہیں، اور اسکے لئے دودھ کو Plastic کا (نرم و لچکدار صورت) میں تبدیل کرنا ہوگا۔ صنعتی اداروں میں اب پلاسٹک مادوں کی بڑی قدر ہے، کیونکہ دھات کو گلانا، ڈھالنا، یا جوڑنا بہت وقت چاہتا ہے، اور اگر ہم نرم و لچکدار چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھانچے بنا بنا کر سخت و خشک کر سکیں تو بڑی آسانی ہے، چنانچہ پچھلے بیس سال کے اندر لاکھوں چیزیں پلاسٹک مادوں سے طیار کی گئی ہیں۔ دودھ کو پلاسٹک بنانے کی کوشش جاری ہے اور ہاتھی دانت کی جگہ اس سے برابر کام لیا جا رہا ہے۔ یعنی جن چیزوں کی طیاری میں ہاتھی دانت سے کام لیا جاتا ہے، ان میں اب دودھ کا "ہاتھی دانت" استعمال ہوتا ہے ـــ دودھ سے ایک خاص Paint (رنگنے کا روغن) بھی طیار کیا جاتا ہے اور گوند بھی۔ یہ گوند اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ ہوائی جہازوں کی لکڑیاں اُسی سے جوڑی جاتی ہیں۔ نفیس کاغذوں کی سطح چکنی کرنے کے لئے بھی Casein ہی کی وارنش کی جاتی ہے ـــ مکھن یا Casein نکالنے کے بعد دودھ کا ۹۲ فی صدی حصہ چھاچھ کی صورت میں رہجاتا ہے، لیکن بیکار یہ بھی نہیں ہے۔ اس سے ربڑ طیار ہونے لگا ہے اور سڑکوں کے Reflectors (عکس ڈالنے والے نشانات) بھی اس سے بننے لگے ہیں۔ ایک خاص قسم کی شکر ہے جسے دودھ کی شکر (Sugar of milk) کہتے ہیں اور جو دواؤں کی طیاری میں بکثرت استعمال ہوتی ہے، یہ شکر بھی چھاچھ ہی سے طیار ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مرغیوں کی ایک مہلک بیماری میں جس کا نام Coccidosis ہے، چھاچھ بہت مفید ثابت ہوئی ہے ـــ چھاچھ سے حیاتین "G" بھی طیار ہوتی ہے جس کے استعمال سے مرغیوں کے بچے بہت جلد بڑھتے اور طیار ہوتے ہیں یہاں تک کہ چھ ہفتے میں ان کا وزن دو پونڈ کے قریب ہو جاتا ہے۔

غزل:- کیسی خوشی کہاں کا غم۔ لذتِ درد بھی ہے ختم
کہتے ہیں جس کو زندگی وہ مری زندگی نہیں

یہ بھی مرا نصیب ہے میں جو ملول ہو گیا
آپ کے التفات میں ورنہ کوئی کمی نہیں

میری نظر اِدھر اُٹھی۔ اُن کی نظر اُدھر جھکی
ہو گئی گفتگو تمام۔ بات مگر ہوئی نہیں

دیکھ سکوں انھیں؟ محال! اُف ری نزاکتِ جمال
پھر بھی مری نگاہ کو شکوۂ نارسی نہیں

وجہ سکوں نہ بن سکا حسن کا التفات بھی
میرے نصیب ہی میں اب کوئی مگر خوشی نہیں

ذوقِ طلب ابھی ہے خام۔ شوق ابھی ہے بے نظام
دل میں ہے سوزِ ناتمام۔ آگ ابھی لگی نہیں

اُن کی نظر نے کی عطا لذتِ بیخودی مجھے
لذتِ بیخودی مگر حاصلِ زندگی نہیں

سید علی ظہیر اکبرآبادی بی۔ اے

غزل :-

جو رات اتنی بھیانک تھی کیا سُہانی ہے
بڑے مزے کی کہانی تری کہانی ہے

میری زباں پہ یہ کس رنگ کی کہانی ہے
شباب و عشق سے معمور زندگانی ہے

گزر گئی شبِ غم ہے نمود صبح نشاط
نفس نفس میں جوانی ہے شادمانی ہے

یہ کس کے کوچے سے آکر نسیم نے چھیڑا
مری رگوں میں نئے خون کی روانی ہے

چمک رہا ہے زمانے میں داغ عشق میرا
سیاہیٔ شبِ دیجور پانی پانی ہے

ٹھکانے لگنے دے مٹی بھی اب یہیں میری
تمام عمر تیرے در کی خاک چھانی ہے

جگا کے خاک کے پتلوں میں درد بھر دیگا
تیرا پیام ہے اور وہ مری زبانی ہے

اُسی کی عمر گزرتی ہے تیری قربت میں
جسے ہراس یہ رہتا ہے موت آنی ہے

سُناؤں گا تمھیں روداد زیست سوچ تو لوں
پُرانی بات ہے بھولی ہوئی کہانی ہے

بہت کڑی ہے تیری راہ اور منزل دور
فگار پانوں میں پیری ہے ناتوانی ہے

دلوں دلوں ہی میں ہوتے ہیں اُن سے رازونیاز
بڑے مزے کی محبت کی زندگانی ہے

اُٹھا رہا ہوں مزے تیرے لطف پنہاں کے
عجیب چیز خموشی ہے بے زبانی ہے

جگر کا نام مٹائے سے مٹ نہیں سکتا
جگر بریلوی
جگہ ہے جہاں عمر جاودانی ہے

علیگڈھ میں ——— ایک خاتون کی خودکشی پر

اور ایک جسم حرص کی الجھن سے چھٹ گیا
اور ایک ذہن رنج مسلسل سے چھٹ گیا

اور ایک روح کاوشِ عقبیٰ سے بچ گئی،
اور ایک جان کاہشِ دنیا سے بچ گئی

اور ایک دل نے رسم کی زنجیر توڑ دی
اور اک جگر نے شاخِ غلامی مروڑ دی

اور اک جبیں فریبِ عقیدت سے بچ گئی
اور اک زبان جرمِ سیاست سے بچ گئی

اور اک شعور موت سے بچ کر نکل گیا
اور اک ضمیر گرنے سے پہلے سنبھل گیا

اور اک خیال عرش کے اس پار جا لگا
اور اک گمان اپنی حدوں سے گزر گیا،

اور ایک نغمہ ساز کی اُلجھن سے چھٹ گیا
اور ایک تیر قیدِ کماں سے رہا ہوا

اور اک کلی نے چاک کیا اپنا پیرہن
اور ایک جگنو توڑ گیا بندشِ چمن،

اور اک کرن غبارِ مسافت میں کھو گئی
اور ایک تتلی آگ کی موجوں پہ سو گئی

اور ایک چاند ٹوٹ کے گم ہو گیا کہیں
اور ایک کشتی ہو گئی دریا میں تہ نشیں

انسان کے خدا! پھر اک عورت کی خودکشی
ٹھکرا کے رکھ گئی ترا فرمانِ زندگی
فضل الدین اثر

شعاع

اُفق چمکا، ہوئی کافور شب کی ظلمتِ پیہم
پیامِ صبح رنگیں ہے، سحر کی آسماں تابی
دمِ خورشید نے اک روح پھونکی نبضِ ہستی میں
تپش پیدا ہوئی ذروں میں مثلِ رقصِ سیمابی
چلی موجِ نسیمِ صبح اُٹھکر کنجِ گلشن سے
گریزاں چشمِ غنچہ سے ہوا کیفِ گرانخوابی
ہر اک شاخِ چمن جھومی، گلوں کی انجمن جھومی
بھری پیمانۂ خورشید سے جوئے مئے نابی!
طلسمِ خوابِ شب ٹوٹا نمودِ صبحِ روشن سے
پرافشاں ہوگئے طائر نکل کر کنجِ گلشن سے

شعاعِ مہر تاباں کیا ہے؟ اک پیغامِ بیداری
سکوتِ غنچۂ گل کو صلائے نغمۂ گفتاری
ہوا ہے سست رو جو قافلہ تاریکیِ شب سے
چمک کر اُس کو دیتی ہے نویدِ برق رفتاری
بجھا دیتی ہے جا کر چرخ پر تاروں کی قندیلیں
زمیں پر آکے ذروں کو عطا کرتی ہے بیداری
چمن کو تابشِ شبنم سے کر دیتی ہے آئینہ،
قبائے گل پہ تارِ زر سے پھر کرتی ہے زرکاری
شعاعِ مہر ہے شاید، دیارِ نور کا قاصد!
جہانِ خاکِ تیرہ پر، ہوا فرمانِ خور جاری
جھلک نورِ ازل کی، جلوۂ خود بیں کا آئینا
یہی بن جائے گی اک دن شرارِ آتشِ سینا

کبھی یہ بن کے برقِ نور تڑپی کوہِ فاراں پر
سمٹ کر بن گئی جگنو، شبِ تارِ بیاباں پر
کبھی شمعِ حقیقت ہے دلِ تاریکِ گوتم میں
کبھی رازِ تجلی ہے، کفِ موسیٰ عمراں پر
کبھی نورِ نگہ بنکر یہ نکلی چشمِ بینا سے
کبھی خود بن گئی پردہ، ضیائے عقلِ انساں پر
کسی کو مشعلِ امید بن کر راہ دکھلائی
گری بنکر کبھی بجلی، کسی کے خرمنِ جاں پر
کیا روشن کبھی صحرا، چراغِ لالہ و گل سے
کبھی بنکر سحر پھیلی، جبینِ ماہِ تاباں پر
ہر اک ذرہ میں پیدا ہے جھلک نورِ حقیقت کی
زمیں سے آسماں تک، موجزن ہے روحِ وحدت کی

تمیزِ رنگ و بو یکسر فریبِ چشمِ باطل ہے
گلستاں میں جو گل ہے، پہلوئے انساں میں وہ دل ہے
تہِ دریا جو گوہر ہے، وہی گلشن میں شبنم ہے
وہی ہے سوزِ پروانہ، جو نورِ شمعِ محفل ہے
زباں پر جو تکلم ہے، وہی لب پر تبسم ہے
وہی ہے آبِ خنجر میں، جو اشکِ چشمِ بسمل ہے
وہی ہے رنگ و بو گل میں، جو نغمہ قلبِ بلبل میں
وہی تابش ہے تاروں میں جو روحِ پیکرِ گل ہے
وہی ہے ایک جلوہ جس سے ہر محفل ہے نورانی
چراغِ ماہ کیا ہے؟ پرتوِ مہرِ درخشانی!!

شمس شیدائی مہسرامی

مُغل لائن لمیٹیڈ

حاجیوں کے جہازات

شاہی سمندری بیڑہ، شاہی ہندوستانی بیڑہ اور شاہی ہوائی فوج کی حفاظت میں سال گزشتہ کا حج بخیریت تمام ہوگیا تھا اور اب مُغل لائن فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ حکومتِ ہند کی رضامندی اور مشورہ سے حاجیوں کے لئے جہازات کی روانگی کا انتظام ہوگیا ہے۔

چونکہ اس وقت لڑائی جاری ہے اس لئے جہازوں کے نام اور اُن کی روانگی کی صحیح صحیح تاریخیں نہیں بتائی جاسکتیں لیکن حج کے جانے والوں کو چاہئے کہ وہ مقررہ تاریخوں میں بندرگاہوں پر پہونچ جائیں اور اسکا انتظام بھی کرلیں کہ انھیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا جو پانچ روز سے زیادہ نہیں ہوگا۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہے :-

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ
فرسٹ کلاس واپسی ٹکٹ (مع کھانے کے)	۴۴۷ روپیہ	۷۱۶ روپیہ
تختۂ جہاز کا تھرڈ کلاس واپسی ٹکٹ	۲۰۳ روپیہ	۱۹۶ روپیہ

اس کے علاوہ ہر مسافر کو روانگی کے وقت بندرگاہ پر جہاز تک پہونچانے اور جدہ میں جہاز سے اُتارنے کے لئے مزید (ے ر) دینا ہوگے

مزید تفصیلات پتہ ذیل سے دریافت کیجئے :-

ٹرنر مورسین کمپنی لمیٹیڈ نمبر ۱۶ بینک اسٹریٹ۔ بمبئی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (۱)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نیاز کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سینکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہت سے ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

خلاصۂ تقدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں :-

۱ — چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ — ہادیئن کا مذہب

۳ — حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و آثار سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر) علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی نگارشی کو دکھایا گیا ہے۔ چونسٹھ صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین)

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۵ء

(اُردو شاعری نمبر) اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام پر مجموعہ اُردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اسکے بعد پھر کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں۔ صفحات ۲۳۶۔ اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۶ء

(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام، اُردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸۔ قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۷ء

ڈراما، اصحاب کہف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت عہ، علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری ۱۹۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۴

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۸

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۱ء

یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول